احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

اگست 2013ء

66واں یومِ آزادی مبارک

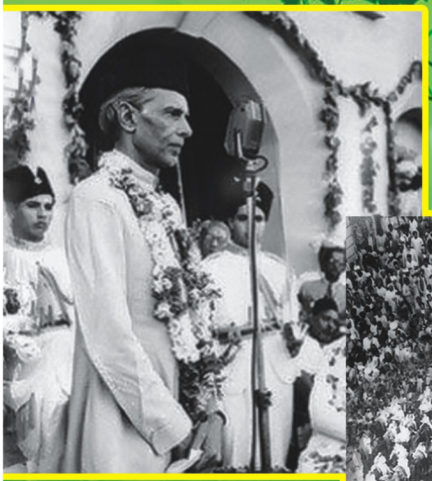

قائدِ اعظمؒ کا تصوّرِ پاکستان

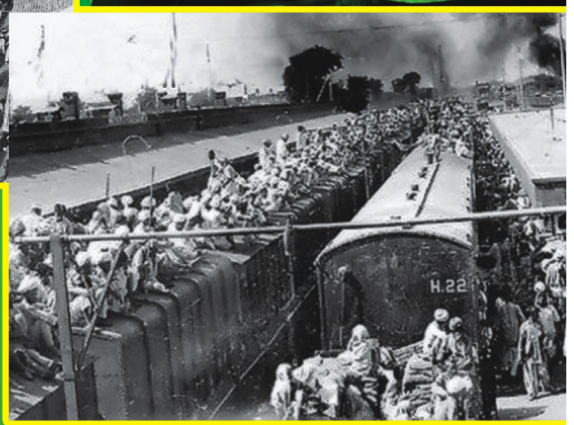

اِسلامی تصوّرِ ریاست اور بیوروکریسی کی اخلاقی تربیت کا ضابطہ

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی تربیتی خطاب

قیامِ پاکستان کی قوتِ محرکہ

''عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی''

حمد باری تعالیٰ جل جلالہٗ

مرا سرمایۂ ہستی تری حمد و ثنا مولا
تری توفیق سے پایا یہ گنج بے بہا مولا

تو لامحدود میں محدود کیا تعریف ہو مجھ سے
نہ تیری ابتدا مولا نہ تیری انتہا مولا

دلِ بے تاب کی تسکیں ہے تیری یاد میں یارب
ترے تذکار کی لذت ہے کتنی جاں فزا مولا

میں کیسے مان لوں رسوا کیا جائے گا محشر میں
ترے محبوب کا جو شخص ہو مدحت سرا مولا

جزا کے دن تو اس خوش بخت کو کتنا نوازے گا
تری خاطر خفا سارے جہاں سے جو رہا مولا

ازل سے کررہے تھے جستجو تیری جہاں والے
بتایا ہے ترے محبوب نے تیرا پتا مولا

تری توحید پر اہلِ جہاں ایمان لے آئے
تری برہان بن کر آگئے جب مصطفیٰ مولا

تری صنعت کا ہیں شہکار یہ مہرو مہ و انجم
تری قدرت کے ہیں عکّاس یہ ارض و سما مولا

طواف کعبۂ اقدس کی پھر توفیق دے مجھ کو
حریمِ جاں میں بھی اک دلنشیں کعبہ بنا مولا

کرم شہزادؔ پر فرما بھی دے اے قادرِ مطلق
کھڑا ہے ہاتھ پھیلائے ترے در پر گدا مولا

(شہزاد مجددی)

نعت بحضور سرورِ کونین ﷺ

چشمِ ادب میں عمر بھر کے رتجگے رہے
آنسو ہزار شاخِ دعا پر کھلے رہے

لوگو نے آسماں کے ستارے چنے، مگر
ہم اُنؐ کے نقشِ پا کی طرف دیکھتے رہے

پھر یوں ہوا کہ نیند میں جاگا مرا نصیب
منظر درِ نبیؐ کے مرے سامنے رہے

کرتا ہوں میں بھی کندِ خضرا سے اکتساب
بوٹے تمام میرے ہرے کے ہرے رہے

چُپ چاپ آنسوؤں کے جلائے ہوئے چراغ
خوشبو کے ساتھ ہم بھی ادب سے کھڑے رہے

سب کی ہتھیلیوں پہ سجائے گئے گلاب
دروازے رحمتوں کے ہمیشہ کُھلے رہے

اسلوبِ نعتِ مرسل آخرؐ ہے منفرد
تازہ حروف بابِ ثنا پر لکھے رہے

روشن اُنہیؐ کے ذکرِ منور سے آج بھی
میری کتابِ عشق کے سب حاشیئے رہے

بڑھ کر کرم کی کالی گھٹا نے چھپا لیا
میرے رفیق مجھ کو کہاں ڈھونڈتے رہے

توشیق جن کی میرے پیمبرؐ نے کی ریاضؔ
زندہ تمدنوں کے وہی ضابطے رہے

(ریاض حسین چودھری)

یہ وطن ہمارا ہے ہم ہیں پاسباں اس کے

پاکستان کا قیام بیسوی صدی کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہے، جس کا تعلق بیک وقت تاریخی، سیاسی، نظریاتی، مذہبی اور جغرافیائی عوامل کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کی بنیادوں میں مسلمانانِ ہند کا خون بھی شامل ہے اور ان کی ان گنت قربانیوں سے حاصل ہونے والی توانائی بھی۔ لیکن اس معجزانہ نعمت کے حصول پر قوم اُسی تاریخی کوتاہی کی مرتکب ہوئی جس کی بھینٹ بڑی بڑی مملکتیں چڑھتی رہیں اور اسلامی تاریخ کے ہر موڑ پر جس کے تباہ کن اثرات بکھرے پڑے ہیں یعنی حکمران مافیے کی بدترین خودغرضی، مالی کرپشن اور عوامی مسائل سے عدم توجہی۔ ہمارے خوبصورت دیس کے المیوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان سب مسائل کی بنیادی وجہ یہاں کسی باقاعدہ نظام کی عدم موجودگی ہے۔ دھونس دھاندلی سے منتخب ہونے والے بدنیت نمائندگان بھلا کیسے مستحکم نظام دے سکتے جہاں ہر شخص یا تو اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا تدارک کر رہا ہے یا خود دوسروں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ دل و دماغ کی توانائیاں جہاں اس قدر منفی رویوں کا مقابلہ کرتی رہیں وہاں ارتقاء، سکون اور ٹھہراؤ خاصا مشکل ہوجاتا ہے۔ وہ معاشرے بانجھ ہوجاتے ہیں جہاں اجتماعی دانش کا فقدان ہوجائے ذاتی مفادات کے حصارات میں رہ رہ کر ہر انسان خودغرض اور خود پرست ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قدم قدم پر صوبائیت اور رنگ و نسل کے جھگڑے کھڑے رہتے ہیں۔

وطن ایک شجر سایہ دار کی مانند ہوتا ہے اس کے نیچے آرام کرنے والا ہر شخص اگر آری پکڑ لے اور درخت کی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر لے جائے تو اگلے دن کوئی اس کے تنے کو بھی کوئی ایندھن کے طور پر استعمال کرلے گا۔ ملک تو گھروں کی طرح محبت، اخوت، ہمدردی، ایثار اور قربانی کی غذا جذب کرکے پروان چڑھتے ہیں۔ ہر شخص اگر اس کے در و دیوار کو کھودنا شروع کردے اور آتے جاتے اپنی غلاظت کے ڈھیر اس کے صحن میں پھینکتا رہے تو تصور کریں وہاں زندگی کس قدر ماتم کناں ہوگی؟ گھر کے دو افراد آپس میں جھگڑیں تو سیانے کہتے ہیں بے برکتی چھا جاتی ہے جہاں سارے ہی آپس میں برسرِ پیکار ہوں وہاں اللہ کی رحمت کیسے ڈیرے ڈالے گی؟ یہ تو کچھ نیک مخلص اور بےنفس لوگوں کے وجود ہیں جو اس زہر بھرے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے آئے روز اپنی توانائیاں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اس بستی میں زندگی ناانصافیوں، خودغرضیوں اور سفاکیوں کے بوجھ تلے سسک رہی ہے۔

پاکستان کا دوسرا بڑا قومی المیہ یہ ہے کہ یہاں قومی یکجہتی کا فقدان ہے۔ مختلف زبانیں، مختلف جغرافیائی اور نسلی شناختیں آج تک ایک قومی دھارے میں نہیں ڈھل سکیں ہمارے ہاں قومی یکجہتی میں رکاوٹ کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ جب تک یہ ختم نہیں ہوں گی ہم ایک قوم نہیں بن سکتے، پہلی وجہ جاگیردارانہ اور وڈیرہ شاہی نظام ہے جس نے ہر شعبہ زندگی میں اونچ نیچ اور آقا و غلام کی واضح لکیر کھینچ رکھی ہے۔ وسائل اور سہولیات ایک طبقے کے پاس جمع ہیں اور مسائل اور مشکلات دوسرے طبقے کے حصے میں کھنچی چلی آتی ہیں۔ دن بہ دن ان کے درمیان واقع خلیج وسیع ہورہی ہے اور آئے روز کے خودکش بم حملے، ڈاکے، قتل و غارت گری کے واقعات اسی بڑھتی ہوئی خلیج کا شاخسانہ ہیں۔

وطن عزیز کی سلامتی، خودداری اور عزت کو خطرے سے دوچار کرنے والا دوسرا بحران معاشی عدم استحکام ہے۔ دین مخالف اور وطن دشمن قوتوں سے قرضوں کا حصول ہماری ایسی مجبوری ہے جو ہمیں عالمی سطح پر بار بار ذلیل و رسوا کررہی ہے۔ وسائل معیشت ہمارے ہاں بہت سے ممالک کے مقابلے میں زیادہ ہیں مگر حکمرانوں سے لے کر ایک معمولی کلرک تک پورا ماحول کرپشن کے کینسر کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ ملکی اداروں کی نیلامی، قومی املاک کی خرید و فروخت اور لوٹ مار ہماری سیاسی اور انتظامی کارگزاری میں شامل ہوگیا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے دشمن وہ نہیں جو اس کی سرحدوں پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں بلکہ وہ ہیں جو ملک کے وسائل کو ذاتی جاگیر سمجھ کر لوٹتے رہے ہیں۔ اس کے اثاثے غیروں کے ہاں فروخت کرتے ہیں اور غریب عوام کو لوٹ کر پیسہ باہر منتقل کرتے ہیں۔ دور کی بات نہیں، گذشتہ دس

بارہ سالوں کے سیاسی کرداروں اور آمریت کے مہروں کو دیکھیں سب کے سب اب ملک چور ثابت ہوچکے ہیں۔ اس بحران پر قابو پانے کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ عوامی شعور کی بیداری ہے۔ ملت فروش حکمران ہمارے کاندھوں پر بیٹھ کر بار بار آگے آتے ہیں، اگر ہم انہیں پہچان لیں اور آئندہ انہیں اپنی ''خدمات'' پیش نہ کریں تو کافی حد تک اس میدان میں مثبت پیش رفت ہوسکتی ہے۔

مندرجہ بالا بحرانوں کا منطقی نتیجہ اور فطری ردعمل جو ایک بڑے بحران کی شکل میں ہمارے سامنے کھڑا ہوگیا ہے، توانائی کا بحران ہے۔ اس وقت پورا ملک اندھیروں میں ڈوب چکا ہے۔ اس ملک میں سالانہ 10 سے 15 فیصد کی شرح سے بجلی کی طلب میں اضافہ ہورہا ہے لیکن گذشتہ 30 سالوں سے یہاں پاور جنریشن پر نہ صرف کوئی توجہ نہیں دی گئی بلکہ توانائی کے لئے مختص فنڈز بھی حکمرانوں نے ہڑپ کر لئے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں 4000 میگاواٹ بجلی ہماری ضرورت سے کم پیدا ہورہی ہے مگر آج بھی سنجیدگی اور دردِ دل کے ساتھ قومی اور سیاسی قیادت اس سلسلے میں کسی امید افزاء پیش رفت سے محروم دکھائی دیتی ہے۔ سرحد، بلوچستان کے قبائلی علاقوں کی طرح کراچی جیسے شہری علاقوں میں آج بھی بجلی چوری کا رجحان معمول کی بات ہے۔ بجلی کی اس شدید قلت کے نتیجے میں روزمرہ مشکلات اور کمر توڑ مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہے۔ خصوصاً لاکھوں غریب لوگ باعزت روزگار سے فارغ ہوگئے ہیں نتیجتاً جرائم کی شرح میں اضافہ ہورہا ہے۔ کاروباری اور گھریلو صارف حالات سے تنگ آکر سڑکوں پر نکل آئے ہیں اور اپنے ہی ملک کی قیمتی املاک کو نقصان پہنچارہے ہیں۔ یہ صورت حال انتہائی خطرناک ہے اور پریشان عوام کو کسی بڑے انقلاب کی طرف دھکیل رہی ہے۔ حلف اٹھانے سے پہلے نئے وزیراعظم نے اعلان کیا تھا کہ میں وزیراعظم ہاؤس کی بجائے سادہ رہائش رکھوں گا مگر اس وقت اسلام آباد کے علاوہ مری اور لاہور میں بھی وزیراعظم ہاؤسز بن چکے ہیں۔ جن قائدین نے کہا تھا ہم اقتدار میں آتے ہی عوام کے مسائل حل کردیں گے انہوں نے حسب وعدہ آتے ہی پہلے سے موجود عوامی مسائل میں بے تحاشا اضافہ کردیا ہے۔ پاکستانی کرنسی دباؤ کا شکار ہے اور مہنگائی کی وجہ سے لوگ خودکشیوں پر مجبور ہیں۔

پاکستانی قوم اس بار 66 واں یوم آزادی منارہی ہے۔ گذشتہ سال 14 اگست کو اپنے گھروں پر قومی پرچم لہرانے والے کتنے ہی بچے اس سال غربت کے ہاتھوں خودکشی کرنے پر مجبور والدین کے سائے سے محروم ہوچکے ہیں۔

تحریک منہاج القرآن سے وابستہ کارکنان ایسے ہی مایوس کن حالات میں علم، عمل، کردار، امید، محبت اور ہمت کے مشعل بردار ہیں۔ بلاشبہ وہ اسی معاشرے، سوسائٹی اور ملک کے باشندے ہیں، انہیں دوسرے لوگوں کی طرح بلکہ دوسروں سے بھی شاید زیادہ تباہ کن حالات سے واسطہ ہوگا مگر حالات کیسے بھی پرفتن کیوں نہ ہوں جواں ہمت لوگوں کا انقلابی سفر جاری رہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ سب کو ساتھ لیکر چلنے کا عہد کرچکے ہوتے ہیں۔ ان کا اخلاق و کردار، ہمت و جرات دوسرے کے لئے راہنما ہوتی ہے۔ مشنری، تحریکی اور انقلابی ساتھیو! پاکستان کسی اور کا نہیں ہمارا اپنا دیس ہے، ہمارا اپنا گھر ہے، ہمارا اپنا گلشن ہے۔ اس کی رکھوالی، اس کی صفائی اور حفاظت ہر کسی سے بڑھ کر آپ کی ذمہ داری ہے۔ ایمان، بصیرت اور علم و دانش کو کام میں لاتے ہوئے فرقہ وارانہ تعفن اور صوبائیت پرستی کے زہر کو زائل کرنے کی کاوشیں جاری رکھیں۔ اس ملک کو ہم نے اسلام کا حقیقی قلعہ بنانا ہے، اسے دشمنوں کی ہولناکیوں سے بچانا ہے، یہ ہمارے بزرگوں کی لاکھوں جانوں کا بدل اور مقدس امانت ہے۔ اس امانت کی حفاظت ہی تقاضائے دین ہے۔

یہ ملک کروڑوں بے آسرا مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ہے۔ اسے اہل نظر اسلام کا قلعہ کہتے آئے ہیں۔ یہ ناموس رسالت ﷺ کے پروانوں اور عظمت اسلام کا خواب دیکھنے والے فرزانوں کا وطن ہے۔ اسے نقصان ہوا تو اسلام کے نظریاتی تشخص پر حرف آئے گا۔ اس لئے اہل وطن! آؤ مل کر، اپنی کوتاہیوں، لغزشوں اور غفلتوں سے توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کے محافظوں کو چوروں کے ساتھ ملکر لوٹ مار کی بجائے ان کا ہاتھ کاٹ پھینکنے کی جرأت عطا فرمائے۔ شہیدوں کی امانت یہ ملک، ملت اسلامیہ کی امیدوں پر پورا اترے۔ خطے کی حفاظت کے لئے نوجوانوں کو صلاحیت اور جذبوں کی دولت سے سرفراز فرمائے۔

ڈاکٹر علی اکبر قادری

القرآن

اسلامی تصورِ ریاست اور بیوروکریسی کی اخلاقی تربیت کا ضابطہ

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب ☆

مرتب: محمد یوسف منہاجین / سلمان محمد طاہرین

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ .

''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو''۔ (النساء: ۵۸)

اسلامی ریاست میں سرکاری افسران کی تربیت کس نہج پر ہونی چاہیے؟ یہ موضوع کئی اعتبارات سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس موقع پر سب سے پہلے اسلامی ریاست کے تصور کو ذہنوں میں واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ بات اپنے بنیادی تصورات کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں جاگزیں نہیں ہوتی اس وقت تک ہم موضوع پر کماحقہ بات نہیں کر سکتے۔

اسلامی تصورِ ریاست

عام طور پر بعض ذہنوں میں یہ مغالطہ پایا جاتا ہے کہ شاید اسلام میں ریاست کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں ہے۔ یہ تصور صرف معلومات کی کمی اور اسلام کے بنیادی ماخذ کا مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ اسلامی ریاست کا تصور قرآن و سنت سے بطور خاص ثابت ہے اور خلافت راشدہ کے عمل اور ان کی سربراہانہ کارگزاری میں اس کی تفصیلات میسر آتی ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ وہ تمام اجزاء جو ہم کسی بھی مغربی ریاست کے تصور کے تحت ریاست میں شامل کرتے ہیں وہ تمام بنیادی اجزاء اسلامی تصورِ ریاست میں بھی موجود ہیں۔

مغربی مفکرین نے ریاست کے درج ذیل اجزائے ترکیبی بیان کئے ہیں:

i۔ مستقل آبادی ii۔ سرحدوں کے اندر مخصوص علاقہ

iii۔ حکومت کا قیام iv۔ حقِ اقتدار

یہ چار اجزائے ترکیبی اگر جمع کئے جائیں تو اس سے ایک سیاسی تشخص وجود میں آتا ہے۔ اسلام میں بھی ریاست ان اجزاء کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تاہم اسلام میں ریاست کا تصور زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ لہٰذا تین بنیادی اضافات اور بھی ہیں جن کا اسلامی ریاست ان چار بنیادی اجزاء کے علاوہ تقاضا کرتی ہے۔ بنیادی تصور ریاست میں اگر درج ذیل اضافے کئے جائیں تو وہ ریاست صحیح معنوں میں اسلامی نظریاتی ریاست کہلائے گی۔

۱۔ نظریہ، مقصد، غرض و غایت (Idealogy)

۲۔ طرزِ حکومت (Nature of Rule)

۳۔ طریقہ کار (Functioning)

یہ تین چیزیں اگر کسی ریاست میں واضح اور متعین

☆ CD#:1791، خطاب نمبر: Hf-06، مورخہ 26 جولائی 1984ء، بمقام: نیپا، لاہور

کر دی جائیں تو وہ ریاست دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو، کوئی بھی زبان بولنے والے افراد پر مشتمل ہو، کسی نسل، قبیلے اور افراد پر مشتمل ہو، خواہ وہ عرب میں ہو یا عجم میں، خواہ وہ کالے یا گورے لوگوں پہ مشتمل ہو، غریب ہوں یا امیر، وہ ریاست اسلامی ریاست بن جاتی ہے۔ اگر یہ عوامل موجود نہ ہوں تو خواہ وہ ریاست سر زمین عرب پر ہو یا سرزمین عجم پر، وہ ریاست اسلامی ریاست کہلانے کی حقدار نہیں۔ آیئے! ان تین عوامل کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں:

ا۔ ریاست کا نظریہ اور غرض و غایت

اسلامی ریاست محض خطۂ زمین یا لوگوں کی موجودگی سے عمل میں نہیں آتی بلکہ اس ریا ست کا ایک نظریہ اور مقصد ہونا چاہیے۔ جس طرح ہم پاکستان کے حوالے سے Ideology of Pakistan (نظریہ پاکستان) کی بات کرتے ہیں۔ برصغیر میں دو بڑی قومیں آباد تھیں ایک ہندو اور دوسری مسلمان۔ ایک عرصہ سے یہاں مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہ رہے تھے۔ حکومت اگرچہ طویل عرصے تک مسلمان حکمرانوں کی رہی مگر ان حکمرانوں نے یہاں کے علاقوں کو فتح کیا اور عوام پر حکومت کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سات آٹھ سو سالہ دور حکومت میں کہیں مسلمان حکمرانوں نے اسلامی تشخص کو غیر مسلم آبادی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس جب مسلمان حکمرانوں کی گرفت کمزور ہوئی اور برطانوی سامراج نے برصغیر پر سیاسی تسلط جمالیا تو ہندو راجے اور مقامی حکمران مسلمانوں پر اپنا کلچر، ثقافت اور نظریہ مسلط کرنے کی کوشش کرتے رہے (جو بھارت میں آج تک جاری ہے)۔ یہاں سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ ہندوستان پر مسلمان حکمران تو موجود ہیں مگر یہ کبھی بھی اسلامی ریاست نہیں بن سکا۔ چنانچہ اسلامی نظریۂ حیات کو آزادانہ اپنانے کے لئے ایک ایسی ریاست کا وجود ضروری ہے جہاں حکومت اور حکومتی ادارے بھی اسلامی بنیادوں پر استوار ہوں اور اسلام کا نظریہ ایک آئینی و دستوری صورت میں ریاست کی قوت نافذہ بن سکے۔ چنانچہ اس بڑے مقصد کو مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں میں اجاگر کیا گیا اور انہوں نے تاریخ کی لازوال قربانیاں دے کر آزادی کی جنگ لڑی اور پاکستان معرض وجود میں آیا۔

مراد یہ ہے کہ یہ ریاست ایک خاص نظامِ حیات کے تحت قائم کی جاتی ہے اور اسی نظریہ (Idealogy) کی بنیاد پر اس ریاست کے ادارے تشکیل پاتے ہیں۔ ان اداروں کے انتظام و انصرام کو چلانے کے لئے ریاست کے بنیادی قوانین اور انتظامی خدوخال کی تشکیل بھی اسی نظریہ کے مطابق طے پاتی ہے۔ پس اس ریاست کا نظریہ، اسلام ہونے کی بناء پر اسلامی ریاست کا پہلا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔

سیکولر ریاست سے مراد

اگر کوئی ریاست کسی نظریے پر قائم نہیں یا اس کی Idealogy مخصوص نہیں تو یہ سیکولر سٹیٹ ہوگی۔ بہت سے ذہن اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اسلامی ریاست بہترین سیکولر ریاست ہوتی ہے۔ سیکولر ریاست سے وہ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کرنے کو سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ یہ تصور بلکل غلط ہے۔ نہ اس کو سیکولرازم کہتے ہیں اور نہ ایسی ریاست کو سیکولر ریاست کہتے ہیں۔

سیکولر ریاست وہ ہوتی ہے جس کو کسی مذہب، کسی دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔۔۔ جو کسی دین و مذہب سے لاتعلق ہو۔۔۔ اس اعتبار سے وہاں کے لوگ جو مذہب اور جو دین چاہیں اپنائیں، جس کو چاہیں رکھیں، کسی مذہب کی عملی مشق اس ریاست میں ہو یا نہ ہو، ایسی ریاست سیکولر کہلاتی ہے۔ ریا ست کو شہری کے سیاسی معاشرتی، تعلیمی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور دیگر بین الاقوامی مسائل سے سروکار ہوتا ہے۔ افراد کے دین و مذہب کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس ریاست کا کوئی تعلق نہیں

ہوتا، ایسی سٹیٹ کو سیکولر سٹیٹ کہتے ہیں۔ سیکولر ریاست کی اس تفہیم کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست کو کبھی بھی سیکولر سٹیٹ تصور نہیں کیا جائے گا۔

سیکولر ریاست کے مقابلے میں اسلامی ریاست ہمیشہ ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک نظریے پر قائم ہوتی ہے۔ اسکا نظریہ دین اسلام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام. (آل عمران :۱۹)

"بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو (بطور) دین (یعنی مکمل نظام حیات کی حیثیت سے) پسند کر لیا" (المائدہ:۳)

یعنی جب قرآن مجید، نظام حیات کو ہمارے لئے مقرر کرتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جب بھی کوئی اجتماعیت وجود میں آئے گی تو وہ اسی مقرر کردہ دین کے مطابق ہو گی۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لا اسلام الا بالجماعة ولا جماعة الا بالامارة. (سنن الدارمی، ۹۱/۱)

"اسلام کا وجود اجتماعیت (organized human society) کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور کوئی اجتماعیت، سربراہ (سیاسی قیادت) کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی"۔

گویا اسلام کا تشخص اجتماعیت پر منحصر ہے اور اجتماعیت قیادت پر منحصر ہے۔ اگر اس روایت کے الفاظ پر غور کیا جائے تو آج کے دور کی ریاست کی تعریف سامنے آتی ہے کہ وہ ایک منظّم سیاسی معاشرہ it is a politically organized human society ہونا چاہئے۔ جو اسلام کے نظام معاشرت و سیاست کا مدعا و مقصد ہے۔

حضور ﷺ کا ہجرت مدینہ کے بعد سب سے پہلے میثاق مدینہ کے ذریعے تین مختلف سیاسی حلیفوں کو تسلیم کر کے، ان کے ذریعے اسلامی نظریے کی بنیاد پر ایک ریاست کو وجود میں لانا اور خود اسکا سربراہ مملکت ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام کی یہ منظّم سرگرمیاں اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک ریاست کا وجود نہ ہو۔ ریاستیں بالعموم کسی نہ کسی نظریہ پر قائم ہوتی ہیں، خواہ یہ نظریہ سیاسی ہو یا معاشی اس لئے کوئی سوشلزم پر قائم ہے تو کوئی کمیونزم پر لیکن اسلامی ریاست وہ ریاست ہوگی جو نظریۂ اسلام پر قائم ہوگی۔

۲۔ طرزِ حکومت

اسلامی تصور ریاست میں دوسرا اہم کردار طرز حکومت nature of rule کا ہے۔ وہ ریاست بے شک کہے کہ میں اسلام کے نظریے پر قائم ہوں، اسکے سربراہ و حکام بے شک اس بات کا دعویٰ کریں لیکن اس ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کا انحصار اس کے طرز حکومت naturer of rule پر منحصر ہے۔ اسلامی ریاست کبھی آمریت و شہنشاہیت پر مبنی نہیں ہوتی۔ جو ریاست آمریت و شہنشاہیت پر قائم ہو وہ اسلامی ریاست نہیں ہوتی۔

اسلامی ریاست کا طرز حکومت قوم کے نمائندوں کے ذریعے ریاست کا نظام چلانا ہے۔ یہ نمائندے کس طرز پر برسر اقتدار آئیں۔ یہ معاملہ قوانین کے اطلاق کے تفصیلی مباحث سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام بنیادی طور پر ان چیزوں پر بحث نہیں کرتا کہ آپ کس طرز کے انتخابات منعقد کروائیں۔ direct الیکشن ہوں یا indirect الیکشن ہوں۔۔۔ اس طرز حکومت کے نتیجے میں صدارتی نظام تشکیل دیں یا پارلیمانی۔۔۔ پہلے صدر یا وزیراعظم کو منتخب کریں۔۔۔ یا پارلیمنٹ

بنائیں۔۔۔ ان تمام چیزوں کی رہنمائی خلافت راشدہ کے نظائر سے ملتی ہیں لیکن تشکیل حکومت کا کوئی مخصوص و متعین طریقہ کار نہیں ہے کہ اس انداز کے ساتھ آپ نظام حکومت اور طرز حکومت تشکیل دیں گے تو یہ اسلامی ہو گا اور دوسرے انداز کے ساتھ تشکیل دیں گے تو یہ غیر اسلامی ہو گا، ایسی سخت قید یا شرط نہیں ہے۔

اسلام کے اس مزاج میں ایک بنیادی فلسفہ کارفرما ہے کہ اسلام ایک آفاقی دین ہے اور اسے ابدالآباد تک انسانی زندگی کے ہر دور، ہر زمانے اور ہر جگہ پر قائم رہنا ہے اور ہر دور کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی تقاضوں کو کماحقہ ادا کرنا ہے۔ اس لئے اسلام نے ان جزئیات کی تفصیلات میں مداخلت نہیں کی۔ جن کا بدلتے رہنا وقت کے ساتھ ساتھ ضروری ہوتا ہے۔ اگر اسلام اس حوالے سے بھی شرائط لگا دیتا اور کوئی سخت ضابطہ مقرر کر دیتا جہاں کے حالات میں وہ مخصوص انداز مناسب نہ ہوتا تو اس علاقے یا ملک میں اسلام قابل عمل نہ رہتا۔ اسلام نے بنیادی اصولوں کا ڈھانچہ دے دیا جس کے اندر آپ اپنے حالات کے مطابق ہر قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے ہیں لیکن بنیادی حدود کار کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ لہذا بنیادی حالات کے مطابق تمام تغیرات کرتے ہوئے قوم کے نمائندوں کے ذریعے باہمی مشاورت کے بنیادی اصول کے تحت قائم ہونے والی ریاست کا ''طرزِ حکومت'' اس ریاست کے اسلامی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ طریقہ کار

اسلامی تصور ریاست کو دیگر تصور ہائے ریاست سے ممتاز کرنے والا تیسرا اہم کردار ملکی معاملات کو چلانے کا طریقہ کار اور لائحہ عمل ہے۔ ریاست کے تمام اجزاء مقنّنہ، عدلیہ، انتظامیہ اور اسکے علاوہ سارے کے سارے اجزاء جو ریاست کو چلاتے ہیں وہ کتاب و سنت کے دیئے ہوئے نظام کے مطابق چلیں۔ اگر اس ریاست کے کام کا رُخ کتاب وسنت کے دیئے ہوئے نظام کے مطابق ہے، قرآن وسنت سے ماخوذ ہے اور اسکے ساتھ کوئی تضاد نہیں پایا جاتا تو وہ طریقہ کار (functioning) کے اعتبار سے اسلامی ریاست ہے۔ لیکن اگر نظریہ بھی اسلام ہو۔۔۔ طرز حکومت جمہوری، مشاورتی، اور شورائی ہو۔۔۔ مگر ریاست اور اسکے اداروں کا طریقہ کار، کام اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کتاب و سنت کے بیان کردہ اصول و قوانین کے مطابق اس میں نہ ہو تو پھر بھی وہ ریاست اسلامی ریاست نہیں۔

لہذا ہر وہ ریاست جو چار بنیادی اجزائے ترکیبی سے وجود میں آئے اور مذکورہ تین بنیادی کردار ''نظریہ، طرزِ حکومت اور طریقہ کار'' اسلامی بنیادی اصولوں کے مطابق اس میں موجود ہوں تو یہ اسلامی ریاست ہے۔

ریاست کے مقاصد کا حصول کیونکر ممکن ہے؟

اسلامی ریاست میں کارفرما مقنّنہ، عدلیہ، انتظامیہ اور وہ تمام ادارے جن سے پوری ریاست کا نظام چلتا ہے، ان ریاستی امور کو چلانے والی یہ مشینری ''سول سروسز'' کہلاتی ہے۔ یہ تمام افراد ریاست کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے متعین ہوتے ہیں۔ یہ ایسے معاشرے کو تشکیل دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو ریاست کے مقصدِ تخلیق کا مظہر دکھائی دے۔ یہی وہ بیوروکریسی یا سرکاری افسران ہیں جن کے ذریعے ریاست کے مقاصد تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر ریاست کا ڈھانچہ کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

سرکاری افسران کے سامنے دو طرح کے مقاصد ہوتے ہیں۔

۱۔ ایک طرح کے مقاصد کا دائرہ کار صرف دفتر کے روزمرہ معاملات کے ساتھ ہے۔

۲۔ دوسری طرح کے مقاصد کا دائرہ کار وسیع ہے جس کا تعلق تمام دفاتر کو ملا کر مقصدِ تخلیق سے ہم آہنگ معاشرہ کی تشکیل ہے۔

سرکاری افسران کو اس لئے متعین کیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے وجود کو سمجھتے ہوئے، اس کے مقاصد کو جانتے ہوئے، اس کے تشخص کو ذہنوں میں

بٹھاتے ہوئے اس معاشرے کی تشکیل کے لئے کام کریں جو معاشرہ اس اسلامی ریاست کی بنیاد ہے۔ گویا ریاست کے مقاصد کی تکمیل کے لئے سرکاری دفاتر میں موجود یہ سول سرسز کے افراد/ بیوروکریسی/ سرکاری افسران کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

بیوروکریسی کی تربیت کے دس اصول

ملکی انتظام و انصرام کو چلانے والے سرکاری افسران/ بیوروکریسی کی اخلاقی تربیت نہایت ضروری ہے تاکہ وہ ریاست کے مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ سول سروسز میں ان افراد کی تقرری کے وقت دوران ملازمت پیشہ وارانہ تربیت کے ساتھ ساتھ اس طرز پر تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے کہ وہ ریاست کے مقاصد کو پورا کرنے کے قابل ہوسکیں۔ آیئے اخلاقی تربیت کے اس 10 نکاتی ضابطہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ جن کا سرکاری افسران کی تربیت کا حصہ ہونا ناگزیر ہے:

۱۔ مناسب تعلیم ۲۔ کردار سازی
۳۔ دیانت ۴۔ عملی قابلیت، اہلیت و استعداد
۵۔ عوامی معاملات کی انجام دہی اور نظم وضبط
۶۔ عوام الناس سے برتاؤ میں برابری اور خیر سگالی
۷۔ بود و باش کے معیار میں سادگی
۸۔ قوانین سازی کے دوران مصلحانہ زاویہ نگاہ
۹۔ صدق و اخلاص ۱۰۔ ادائیگی حقوق کا جذبہ

ذیل میں ان خصوصیات کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

۱۔ مناسب تعلیم

سرکاری افسران اور بیوروکریسی کی تربیت کے لئے مناسب تعلیم از حد ضروری ہے۔ اس تعلیم سے مراد درج ذیل دو طرح کی تعلیم ہے:

۱۔ دینی و مذہبی تعلیم (Religious Education)

جس میں بنیادی عقائد، قرآن و سنت، سیرت طیبہ، فقہ اور تاریخ بطور خاص اہمیت کے حامل شعبے ہیں۔

۲۔ منصبی تقاضوں کی حامل تعلیم (Professional Education)

سرکاری افسر کوئی مبلغ نہیں ہوتا، مسجد کا خطیب نہیں ہوتا، نہ قرآن وحدیث کی تعلیم اس نے کسی کو دینی ہے پھر اس کو مذہبی تعلیم کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے تو دین کے بارے میں کچھ نہ کچھ شعور تو ہر شہری کے لئے ضروری ہے لیکن خصوصا سرکاری افسر کے لئے اس کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ اس نے تو آفس کے معاملات کو دیکھنا ہے، عام شہری سے زیادہ سرکاری افسر کے لئے دینی شعور کیوں ضروری ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سرکاری حکام دراصل قوم کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے لئے ایک اصول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اہلِ حق) صاحبانِ اَمر کی'' (النساء:۵۹)

مسلمانوں پر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت کے بعد صاحبانِ امر کی اطاعت واجب ہوتی ہے اور ان کی اطاعت نہ کرنا شہریوں کو گنہگار کرتا ہے۔ صرف خدا اور رسول ﷺ کے احکام کو ماننے سے مسلمان گنہگار نہیں ہوتا بلکہ اسلامی ریاست کا سرکاری افسر جو احکام دے اگر وہ احکامات خدا اور سنت کے مطابق ہوں تو اس کو ماننا بھی ضروری ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ سرکاری افسر جو پالیسی دے وہ پالیسی قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ اب اگر اس کے پاس قرآن وسنت کا شعور ہوگا تو تب وہ ایسی پالیسی بنانے کی اہلیت رکھتا ہوگا۔ نیز غیر اسلامی پالیسی یا آرڈر دینے سے اجتناب برتے گا جو اسلامی احکامات کے منافی ہو۔

یہ پالیسی علماء نہیں بناتے بلکہ شعبہ جات کے سربراہان بناتے ہیں۔ لہذا ان کے اندر اتنی معلومات ہونی

چاہیے کہ وہ سمجھ سکے کہ اسلامی شریعت کا عمومی مزاج کیا ہے؟ اگر کہیں دشواری پیدا ہو تو اہل علم سے پوچھ لے تا کہ پالیسی ایسی نہ بن جائے جہاں کسی سطح پر تضاد آ جائے کیونکہ ان کے احکام کو ماننا واجب اور انکار گناہ ہے۔ لہذا ان کے منصب کا تقاضا ہے کہ وہ دین اور مذہب کا ضرورت کی حد تک شعور رکھیں اس لئے کہ قرآن کہتا ہے:

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (التوبہ:۱۱۲)

''نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی سے روکنے والے''

یہ لوگ نیکی کا حکم دینے والے ہوتے ہیں اور لوگوں کو بدی سے بچانے والے ہوتے ہیں۔ ان کا مقام حضور ﷺ کی اتباع میں ''امرو ناہی) کا ہے۔ ''امر'' سے مراد نیکی کا حکم دینے والا ہے اور ''ناہی'' سے مراد برائی سے روکنے والا ہے۔ بنیادی طور پر یہ منصب و مقام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہوتا ہے۔ تاہم اسلامی ریاست کا حاکم/ سول سرونٹ/ سرکاری افسر/ بیوروکریٹ اپنے ذمہ فرائض کی وجہ سے حضور ﷺ کا نائب ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں حضور ﷺ کے اس منصب کا تذکرہ یوں کیا گیا:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ.

''جو انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع فرماتے ہیں''۔ (الاعراف:۱۵۷)

حضور ﷺ کی نیابت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ ہے۔ ارشاد فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''تم بہترین اُمّت ہو جو سب لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے ظاہر کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو'' (آل عمران:۱۱۰)

اس امت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ہر سرکاری افسر اپنی اپنی سطح پر اس کا ذمہ دار ہے۔ پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو فریضہ مسجد کا ایک امام اور خطیب مسجد کھڑا ہو کر نبھا رہا ہے، وہ صرف نظریہ و فکر کی بات کرتا ہے لیکن اس کو عملی شکل میں ڈھالنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ کام ایک سرکاری افسر کر سکتا ہے۔ جس طرح تعلیم قرآن ایک مبلغ بیان کر سکتا ہے لیکن ایک سرکاری افسر اس کو عملی شکل میں لا سکتا ہے۔ اس لئے سرکاری افسر/ بیوروکریٹ میں دین کا شعور پایا جانا عام شہری کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔

بیوروکریسی کے فرائض

قرآن مجید نے افسران اور حکام کے لئے دو ٹوک ھدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

''(یہ اہلِ حق) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دے دیں (تو) وہ نماز (کا نظام) قائم کریں اور زکوٰۃ کی ادائیگی (کا انتظام) کریں اور (پورے معاشرے میں نیکی اور) بھلائی کا حکم کریں اور (لوگوں کو) برائی سے روک دیں،'' (الحج:۴۱)

اس آیت کریمہ میں سرکاری عہدہ و منصب سنبھالنے کے بعد سرکاری افسر یا بیوروکریٹ کے لئے بنیادی چار ذمہ داریاں مختص کی گئی ہیں:

۱۔ نظام صلوٰۃ کا باقاعدہ قیام
۲۔ نظام صدقات کا قیام
۳۔ نیکیوں کے فروغ کے اقدامات
۴۔ برائیوں کو روکنے کے اقدامات

۱۔ اس سے مراد ان حکام اور افسران کا صرف دفتری اوقات میں اپنے ماتحت احباب کو نماز پڑھانا ہی نہیں بلکہ نظام صلوٰۃ اس انداز سے قائم کیا جائے تا کہ اس سے spiritual welfare of Society کی ضمانت نصیب ہو۔ بنیادی بات یہ ہے کہ وہ مثبت روحانی اقدار جو اللہ تعالیٰ نماز کے ذریعے پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ اقدار نماز کے ذریعے حکام لوگوں میں پیدا کریں یعنی

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ.

"بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے" (العنکبوت:۴۵)

نظام صلوۃ کے قیام کا مقصد صرف دو وقت کی نماز دفتروں میں کرا دینا ہی نہیں بلکہ اصل مقصد لوگوں میں وہ روح پیدا کر دی جائے کہ وہ برائی اور بے حیائی سے خود بھی رک جائیں اور معاشرے کو بھی روک سکیں۔ یہ حکام کی ذمہ داری ہے۔ یہ روح اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک سرکاری افسر اور بیوروکریٹ کے اندر خود اس کا شعور موجود نہ ہو۔

۲۔ مذکورہ آیت کریمہ میں سول سرونٹ، سرکاری افسر، بیورو کریٹ کی دوسری ذمہ داری باقاعدہ نظام صدقات کو قائم کرنا ہے تاکہ اس کے ذریعے socio economic welfare of society کی ضمانت ہو۔ گویا معاشرے کے اندر اسلام کے روحانی نظام کو نافذ کرنا بھی سرکاری افسران اور حکام کی ذمہ داری ہے اور یہ دینی شعور و بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۳۔ سول سرونٹ، سرکاری افسر کی تیسری ذمہ داری نیکیوں کا فروغ ہے تاکہ اس کے ذریعے socio moral welfare of society کی گارنٹی دی جا سکے۔ اس سے مراد صرف یہ نہیں کہ اگر کوئی افسر ذاتی طور پر نیک ہے تو وہ سائل کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے دو چار کلمات نصیحت یا تبلیغ کے بھی کہہ دے۔ نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی تمام استعداد بروئے کار لا کر یہ کوشش کرے کہ اس کے دفتر، اسکے اردگرد اور اسکے محلے میں اچھے اخلاق و اقدار فروغ پائیں۔

۴۔ قرآن مجید کی رو سے اسلامی ریاست کی بیوروکریسی کی ذمہ داریوں میں سے چوتھی ذمہ داری برائیوں سے روکنا ہے۔

جب برائیوں کے خاتمے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی، سماجی اور قانونی سطح پر ہر برائی کے خاتمہ کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ قرآن مجید نے سرکاری افسران کی ذمہ داریوں کے جو اصول وضع کیے اس کا عملی مظاہرہ ہمیں خلافت راشدہ کے دور میں نظر آتا ہے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ سرکاری افسران کو متعین کرتے وقت فرماتے:

انی لم ابعثکم امراء و لاجبارین و لکن بعثتکم ائمۃ الھدیٰ یھدیٰ بکم.

"میں نے تمہیں امراء یعنی لوگوں کے لئے امیر اور قائد اور ان کا کوئی مالک اور ان پر ظلم کرنے والا مقرر نہیں کیا بلکہ میں نے آپ کو ان کا رہبر اور رہنماء مقرر کیا ہے تاکہ آپ کے ذریعے ان کی رہنمائی ہو سکے"۔

(کتاب الخراج، امام ابو یوسف)

ایک اور موقع پر رعایا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ابعثھم الیکم لیعلموا کم دینکم و سنت نبیکم۔

"میں سرکاری افسران کو تمہارے پاس اس لئے مقرر کرتا ہوں تاکہ یہ تمہیں اللہ کے دین کی تعلیم دیں اور حضور ﷺ کی سنت کی تعلیم دیں"

گویا سرکاری افسران حضور ﷺ کی سنت کی عملی تعلیم دینے کے مقصد کے لئے متعین کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی ٹریننگ کے دوران مناسب دینی تعلیم پر بھرپور انداز میں توجہ دی جائے۔

دینی شعور کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کے تقاضوں کے مطابق عصری اور ٹیکنکل تعلیم بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر معاملات کے مالہ و ماعلیہ اور ذمہ داریوں کے تقاضوں کو اگر وہ افسر نہیں سمجھ سکتا تو وہ اس قابل نہیں کہ اسے وہ ذمہ داری دی جائے۔

۲۔ ستھرا کردار

سرکاری افسران کی تربیت کے دوران دینی شعور کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی پر بھی توجہ دینا از حد ضروری ہے۔ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا:

وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ. (البقرہ:۲۴۷)

''اور اسے علم اور جسم میں زیادہ کشادگی عطا فرما دی ہے''

یہ قرآن نے اصول بنایا ہے کہ جس کو ذمہ داری دی جائے وہ ظاہری شخصیت اور علمی اعتبار سے مضبوط ہو۔ یعنی integrity of character، کردار میں کھرا پن اور راست بازی ہونی چاہئے کیونکہ سرکاری افسران کی تعیناتی کا مقصد بھی دین اور سنت رسول ﷺ کا فروغ ہے اور صاف ظاہر ہے کہ کردار کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر ان کے فرائض میں ہے اور ان فرائض کی بجا آوری کے لئے کردار کی پختگی اس کی بنیاد ہے۔ اس لئے قرآن نے کہا کہ جہاں علمی طور پر اور اپنے پیشہ کے اعتبار سے ان کا مضبوط ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے کام کی نزاکت کو سمجھیں تو وہاں ان کے کردار میں بھی کھرا پن ہونا چاہئے کیونکہ اس کے بغیر امانت داری سے وہ ذمہ داریوں کو نہیں نبھا سکتے۔

۳۔ دیانت

سرکاری افسران کو تربیت کے دوران امانت و دیانت کے تصور کو مکمل ذہن نشین کروانا نہایت ضروری ہے۔ شومئی قسمت کہ سرکاری افسران، سول سرونٹس، بیوروکریسی کی تربیت کے دوران اس امر پر توجہ نہیں دی جاتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ یہ منصب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو امانت کے طور پر عطا ہوا ہے۔ یہ ایک مشروط معاہدہ ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امانت کو دیانت داری کے ساتھ نبھائیں اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی، کسی کی حق تلفی ہو گئی اور آپ اس ٹیکنیکل کام کے اہل نہ ہوئے تو یہ بد دیانتی متصور ہوگی۔ قرآن حکیم نے پیشہ وارانہ ذمہ داریوں اور سرکاری ذمہ داریوں کو امانات کے ساتھ تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا.

''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں''۔ (النساء: ۵۸)

اور پھر ان امانتوں کو سنبھالنے والوں، سرکاری افسران/ حکام/ بیوروکریسی کے لئے فرمایا:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ

''اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو'' (النساء، ۵۸)

لوگوں کے معاملات تمہارے پاس آئیں گے۔۔۔ کبھی ان کے پنشن کے مسائل ہیں۔۔۔ کسی کی تنخواہوں کے مسائل ہوں گے۔۔۔ کبھی ترقیاتی فنڈز اور عوامی نوعیت کے مختلف معاملات آئیں گے۔۔۔ اس موقع پر عدل کے ساتھ اس امانت کو نبھانا اور دیانت کے دامن کو نہ چھوڑنا تم پر لازم ہوگا۔ اسی لئے اللہ نے تمہیں اس منصب پر بٹھایا کہ تم عدل وانصاف کرو۔ جب تمہارے پاس کوئی حقدار مسئلہ لے کر آئے تو اس کا مسئلہ دیانتداری سے حل کرو۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ. (الضحیٰ:۱۰)

''اور (اپنے در کے) کسی منگتے کو نہ جھڑکیں''۔

سوالی آپ کے پاس آئے تو جس کا جو حق بنتا ہو اس کو کبھی خالی نہ لوٹاؤ۔ اسے یہ مت کہو کے بعد میں آنا، ابھی ٹائم نہیں، جب بھی آپ کے پاس آئیں انکا کام کردیں۔ اگر ان کا حق ادا نہ کیا تو گنہگار ہوں گے اور یہ عدل کے خلاف ہوگا جس کا جواب دینا ہوگا۔ ارشاد فرمایا:

وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ.

''ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا'' (الاحقاف:۹۱)

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

''اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے'' (الحج:۱۰)

یعنی وہ اللہ جس کا جو حق بنتا ہو اس کے ساتھ رتی برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اس چیز کو کبھی اپنے آڑے نہیں آنے دیتا کہ جو لوگ میرے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں یا میری نافرمانی کرتے ہیں، انہیں نہ دوں، ان کا رزق روک لوں، ان پر زیادتی کروں، ان کو بیمار کر دوں، اس

دنیا میں ترقی نہ کرنے دوں۔

آج وہ قومیں جو دنیا میں ترقی کررہی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی نہیں لاتیں مگر چونکہ دنیا کی ترقی کے تقاضے پورے کرتی ہیں اس لئے عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی محنت پر اللہ تعالیٰ ان کو ترقی دے۔ وہ لوگ جو ترقی کے تقاضے پورے کررہے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ ترقی دیتا ہے خواہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم۔ اگر غیر مسلم کو محنت کے باوجود ترقی نہ ملے تو یہ ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مومن بھی میرے بندے ہیں اور کافر بھی میرے بندے ہیں۔ میں ہر ایک کا رب ہوں۔ دنیا کے تقاضے جو کوئی پورے کرے گا یہ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کو ترقی دوں گا۔ میں سب کچھ کرسکتا ہوں لیکن ظلم نہیں کرسکتا۔

دوسری طرف اگر ہم بندے کے رویے کو دیکھیں تو اس کے ہاتھ میں رزق، عمر، زندگی، موت، جیسے اہم امور نہیں ہیں۔ وہ اس دنیا میں بھی جوابدہ ہے اور آخرت میں بھی جواب دہ ہے لیکن پھر بھی وہ دوسرے بندوں کی حق تلفی کرتا ہے۔۔۔ ان کے جائز کاموں پر بھی انہیں تنگ کرتا ہے۔۔۔ اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔۔۔ اور وہ کام جو اللہ اختیار و طاقت اور لوگوں کی نافرمانی کے باوجود نہیں کرتا، ایک بندہ خود کو خدا سے بڑی خدائی والی کرسی پر بیٹھا ہوا سمجھ کر کرتا رہتا ہے۔

سرکاری افسران کی اس نہج پر تربیت ضروری ہے تاکہ ان کا ذہن عوامی خدمت کے تقاضوں کو بروئے کار لاسکے۔ زندگی کا ایک زاویہ نگاہ معلوم ہو کہ ہم نے کیا کرنا ہے، ہم امراء اور جبارین نہیں ہیں بلکہ مخلوق کی خدمت کے لئے فائز کئے گئے ہیں۔

ایک مقام پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا:

میں نے تمہیں لوگوں کی کھالیں اتارنے کے لئے مقرر نہیں کیا بلکہ میں نے تمہیں ان کی خدمت کے لئے رکھا ہے۔

افسوس کہ ہم ان تعلیمات کو چھوڑ گئے اور مغرب نے عملاً ان تعلیمات کو اپنالیا جن پر قرآن و حدیث اور خلفاء راشدین نے ترقی کی ضمانت دی۔ آج ہم مغربی دنیا میں عملاً اس کا تصور دیکھتے ہیں۔ یورپ، امریکہ، ناروے اور دیگر یورپین ممالک میں دفتری معمول کے کام اعلیٰ مناصب پر فائز افسران خود کرتے ہیں اور ان کاموں کی انجام دہی میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ دروازہ کھولنا، مہمان کو پانی پلانا، کرسی لے آنا، رجسٹر یا کاغذات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اُن ممالک کے افسران کے ہاں قطعاً معیوب نہیں ہے۔ وزراء گاڑی پر دفتر جائیں یا سائیکل پر، ان کے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں جبکہ ان امور کو کرنا ہم اپنی عزت اور منصب کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کاموں کو اپنے ہاتھوں سے کرنا ہم اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور جس روز کرلیں تو دو دو مہینے تشہیر کرتے ہیں۔

مغربی ممالک میں جائز کام کو کوئی نہیں روک سکتا وہاں رشوت وسفارش نہیں ہے۔ ہر چیز ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ ہماری طرح کی کیفیت نہیں کہ کوئی کام رشوت و سفارش کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی تعلیم آقا دوجہاں ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے دی تھی۔

مگر افسوس صد افسوس کہ ان سنہری تعلیمات پر غیروں نے عمل کرنا شروع کردیا اور مسلمانوں نے سستی، کاہلی، بددیانتی اور کرپشن کو ''ریاستی فریضہ'' سمجھ لیا۔

۴۔ عوام الناس سے برتاؤ

سرکاری افسران کی تربیت کے دوران سائلین کے ساتھ اچھے برتاؤ اور حسن اخلاق کی تربیت از حد ضروری ہے۔ عوام الناس کے حقوق کی ادائیگی اور سائلین کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنے کی تعلیمات خلافت راشدہ کے زمانہ میں جابجا نظر آتی ہیں۔ جب وہ سرکاری افسران کا تقرر کرتے تو ان سے کہتے کہ عوام کے ساتھ تمہارا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔۔۔؟ ان کو باقاعدہ اسکی تربیت دی جاتی، ان کے تقرر نامہ پر لکھا جاتا کہ تم نے

کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرنا۔۔۔ کسی کی بے عزتی نہ کرنا۔۔۔ تمہیں لوگوں کی عزت نفس کو قائم کرنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ اگر کوئی غلط سوال یا مطالبہ لے کر آئے تو آپ کے کردار، حوصلے اور ظرف میں اس کو برداشت کرنے کی وسعت ہونی چاہیے۔ اس میں اور تم میں فرق ہونا چاہیے۔ وہ سائل ہے اور آپ کا منصب کچھ اور ہے۔ اگر اسکی سوچ کا معیار بھی وہی ہو جو آپ چاہتے ہیں تو وہ سائل نہ ہوتا بلکہ آپ کے منصب پر فائز ہوتا۔ اگر سائل کے ذہنی معیار پر آپ کو غصہ آتا ہے تو اس کو برداشت کریں۔ مقصد یہ ہے جس کو جس منصب پر بٹھایا جائے، اسی قدر وسیع ظرفی اس کے اندر ہونا چاہیے۔

ارشاد فرمایا:

من تواضع لله درجة رافعه الله.

(مسند احمد بن حنبل، ۳:۷۶)

''جو شخص اللہ کو راضی کرنے کے لئے جھکتا چلا جاتا ہے اللہ اس کو بلند کر دیتا ہے''۔

۵۔ معیارِ زندگی میں سادگی

خلفاء راشدین سرکاری افسران کی تقرری کے دوران تحریری طور پر اُن کو آگاہ کرتے کہ کوئی شخص رشوت نہیں لے سکتا، بد دیانتی نہیں کرسکتا، دھاندلی نہیں کرسکتا۔ حضور ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں جب کبھی کسی کو کسی منصب پر مقرر کیا جاتا تو اس کی تنخواہ بھی مقرر کی جاتی اور پھر اس کی تنخواہ اور اس کے رہنے کے معیار کا موازنہ کیا جاتا کہ کہیں وہ بددیانتی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا۔

سرکاری افسر میں سادگی اس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ تکلف کرے گا تو بے جا اسراف کا مرتکب ہوگا، یہ اسراف اسے لازماً کرپشن اور مالی بددیانتی تک پہنچا دے گا۔

سادگی چار پانچ نوعیت کی ہے:

۱۔ رہائش میں سادگی ۲۔ لباس میں سادگی
۳۔ کھانے میں سادگی ۴۔ ذرائع آمد و رفت میں سادگی
۵۔ معاملات میں سادگی

عملی حقیقتوں کو آنکھ کھول کر دیکھا جاتا تھا کہ اخراجات کتنے ہیں اور وسائل کتنے ہیں؟ اگر وسائل سے بڑھ کر اخراجات سامنے آتے تو اس کو برطرف کر دیا جاتا، سزا دی جاتی، جرمانہ کیا جاتا۔ الغرض ان کی تربیت اس نہج پر کی جاتی کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کے بارے سوچ بھی نہ سکتا۔ نیز اپنے عمل سے بھی اس بات کو لوگوں کے لئے مثال کے طور پر پیش کرتے۔

سیدنا عمر فاروقؓ ہر امیر کو جو بنیادی ہدایات دیتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ تم نے گھوڑے یا اونٹ کے کجاوے کو غیر ضروری حد تک آرام دہ تو نہیں رکھا ہوا؟ تمہاری خوراک میں نازونخرا یا کروفر تو نہیں۔ فرماتے کہ چھانے بغیر آٹے کی روٹی کو معمول بنانا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ سادگی اور خدمت کا جذبہ قائم رہے۔ اسی طرح عمال کی رہائش گاہوں پر بھی سیدنا عمرؓ کی نظر رہتی تھی، جہاں شکایت ملتی ان کی رہائش گاہوں کو آگ لگا دینے کا حکم بھی دینے سے گریز نہ کرتے۔

اس سادگی اور کفایت شعاری کا حکم وہی دے سکتا ہے جو پہلے اس کا عملی نمونہ پیش کرسکتا ہو۔ سیدنا ابن خطاب جن کی تین براعظموں پر حکومت تھی ان کی اپنی کیا کیفیت ہوتی تھی، اکثر وفود آپ کو ملنے مدینہ طیبہ آتے تو دیکھتے امیرالمومنین اینٹ پر سر رکھے فرش پر آرام کر رہے ہوتے۔ پیوند لگے کپڑے زیب تن فرماتے۔ صحابہ کرامؓ کے ایک وفد نے آپ کی توجہ مبذول کروائی کہ اسلامی دارالحکومت میں لوگ دور سے آتے ہیں ان کے قیام و طعام کے لئے کوئی سرکاری نظام ہوتا کہ مہمانوں کو باعزت کھلایا اور ٹھہرایا جاسکے۔ نیز خلیفہ رسول ﷺ کو خود بھی باعزت رہائش اور دفتر کی ضرورت ہے، سلطنت کے شایانِ شان لباس اور سواری کا اہتمام ضروری ہے۔

یہ درخواست لے کر بارگاہ خلافت میں جانے والی شخصیت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور خود ان کی

اپنی صاحبزادی ام المومنین سیدہ حفصہؓ تھیں۔ روایت میں ہے کہ جب یہ دونوں امہات المومنین، سیدنا عمرؓ کے پاس تجاویز لے کر گئیں تو پرامید تھیں مگر جب اٹھ کر باہر آئیں تو ان دونوں کے آنسو رواں تھے۔ دونوں نے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور فرمارہی تھیں: کاش ہم یہ مطالبات لے کر امیرالمومنین کے پاس نہ جاتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں اور سادگی و کفایت شعاری سے ثابت کردیا تھا کہ حکومت کا رعب حکمران کے محلات سے مشروط نہیں بلکہ ان کے جذبۂ خدمت اور سادگی سے وابستہ ہے۔ تاریخ آج تک عمر جیسا عادل، منظّم اور حقوق کا خیال رکھنے والا دوسرا حکمران پیش نہیں کرسکی۔ انہوں نے سادگی میں اپنی عظمت کا لوہا منوایا اور بعد کے سلاطین نے تکلفات میں قیصر و کسریٰ کو مات دے دی۔ ہماری افسر شاہی اور حکمرانوں کو اپنے اسلاف کی اس سیرت پر غور کرنا چاہئے۔

۶۔ معاملات کی انجام دہی میں عدل

سرکاری افسر کا یہ حق نہیں کہ وہ امیر اور غریب کے کام میں کوئی فرق کرے۔ وہ جس حکومت کا عہدیدار اور ذمہ دار ہے وہ سب کے لئے ایک جیسی ہے۔ Vip کلچر کا رواج عام ہوجائے تو غریب اور نادار لوگ اپنے حقوق کے لئے ترس جاتے ہیں۔ اس سے انتشار اور بے چینی معاشروں کا مقدر بنتی ہے۔ معاملات کی انجام دہی میں عدل برتنا بنیادی خصوصیت ہے اس کو ہمارے سرکاری اداروں میں اہتمام کے ساتھ تربیت کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ بڑا آئے تو فوری اس کا مسئلہ حل کردے اور اگر وہی کیس کسی غریب کا ہو تو اس کو مہینوں اور سالوں کے لئے لٹکا دیا جائے۔ قرآن اس سلسلے میں رہنمائی کرتا ہے:

اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا۔

''اگر چہ مالدار ہے یا محتاج، اللہ ان دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ سو تم خواہش نفس کی پیروی نہ کیا کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ (گے)''۔ (النساء:۱۳۵)

نہ کسی کی امارت آپ پر اثر انداز ہو، نہ کسی کی غربت اثر انداز ہو۔ سرکاری عہدیداران ان امتیازات سے بالاتر ہوکر کام کریں۔

ایک مقام پر سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا:

''ایسا نہ کرو کے بڑوں کے لئے دروازے کھول دو اور چھوٹوں کے لئے بند کر دو اگر ایسا کرو گے تو امیر غریب کو کھا جائے گا''۔

اس لئے کہ غریب کی داد رسی کوئی نہیں کرتا اور اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ ہم اپنی سوسائٹی میں دیکھتے ہیں کہ ایک سپاہی یا ایک پٹواری یا ایک چھوٹا کلرک اگر کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور سائل اس کے ازالہ کے لئے افسران تک رسائی حاصل کرلے تو ایک مدت کے بعد وہی کیس پھر اسی پٹواری، اسی کلرک یا اسی تھانیدار کے پاس آجاتا ہے۔ ایسی صورت حال ہو تو کوئی حکام بالا کو شکایت ہی کیوں کرے گا؟ اسے معلوم ہے کہ شکایت کر کے بھی کچلا جانا ہے لہذا وہ محرومیوں کی زندگی بسر کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے حکم دیا گیا کہ ہر ایک کے لئے انصاف اور عدل کے ساتھ اپنے دروازے کھلے رکھو اگر تمہارے دروازے امتیازات کو اختیار کریں گے تو تمہاری سوسائٹی کے بڑے لوگ غریبوں کو کھا جائیں گے۔

حکام کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ بڑے لوگوں سے مراسم قائم کریں جس سے سوسائٹی پر برے اثرات مرتب ہوں۔ عوام سے مراسم کے قیام کے حوالے سے سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا:

''اگر اپنے علاقے میں کسی مریض کی عیادت کر سکو اور کرنے کو نہ جاؤ تو پھر بھی برطرف ہو۔۔۔ کسی کی تعزیت کرسکو اور کرنے کو نہ جاؤ پھر بھی برطرف ہو۔۔۔ گویا اس حد تک معاشرے کے ساتھ وابستہ رہنے کی تعلیم دی۔

یہی وجہ ہے کہ اسی معاشرتی تعلقات کے استحکام کے لئے یہ تصور دیا کہ حاکم اپنے علاقے کی مسجد میں جماعت کرائے تاکہ ماتحت نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ اپنے افسر سے بلاخوف ملتے رہیں۔ ماتحت کے ساتھ ایک تعلق بھی پیداہو اورلوگوں کوآپ سے ملنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو۔

۷۔ قانون سازی کے دوران زاویۂ نگاہ

سرکاری افسران کی تربیت میں یہ امر خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ سرکاری افسران کا رویہ جمہوری ہونا چاہئے یعنی قومی پالیسیز کو اپنے مفادات کی روشنی میں نہ بناؤ بلکہ جس طبقے کے متعلق پالیسی بنا رہے ہو ان کو شریک کرو تاکہ تمہارے سامنے مسائل کی حقیقت آسکے۔ کم تنخواہ دار طبقہ کے حوالے سے بیوروکریسی جب کوئی پالیسی بنائے تو وہ حقیقی صورتحال کو سامنے رکھے۔ کیونکہ معاشرتی اعتبار سے اصل مسائل کا شکار پالیسی بنانے والے وہ افسر نہیں بلکہ وہ ملازم ہوتا ہے جو نچلے درجہ کا ہے۔ جس نے مکان کا کرایہ، بچوں کے تعلیمی اخراجات، طبی سہولیات اور ضروریات زندگی کا سامان اپنے زیر کفالت افراد کو ہر صورت مہیا کرنا ہے۔ یہ نہ ہو کہ سرکاری افسران کی غلط پالیسیوں کے سبب وہ بیچارہ عید اور خوشیوں کے ایام میں بھی اپنے بچوں کو اچھا لباس مہیا کرنے سے قاصر رہے۔ ان کی تقدیروں کے فیصلے جب وہ لوگ کرتے ہیں جن کے سامنے اصل حقائق نہیں ہوتے تو اس سے طبقاتی تفریق پیدا ہوتی ہے۔ بالعموم ہماری بیوروکریسی ایسی پالیسیاں بناتی ہے جن سے مفاد ان بالائی افسران ہی کو ملتا ہے اور اس سے پورے کا پورا معاشرتی ڈھانچہ تباہ ہوجاتا ہے۔

حضور ﷺ نے جو عوامی معاملات و مسائل کو حل کرنے کے لئے جو اصول وقوانین اور عملی ڈھانچہ دیا وہ ہمارے لئے وہی اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت کے بعد ہر دس آدمیوں کے اوپر ایک عریف مقرر کیا، پھر دس عریفوں پر ایک نقیب رکھا۔ عوام کے مسائل آقا دوجہاں ﷺ براہ راست سنا کرتے۔۔۔ان کے نقیبوں سے پوچھتے۔۔۔ان کے عریفوں سے پوچھتے۔۔۔ ان کے مسائل کی اصل تصویر دیکھ کر پھر پالیسی بناتے۔ جب کبھی صحابہ کو آپ ﷺ میٹنگ میں بلاتے، امیر وغریب تمام صحابہ شامل مشاورت ہوتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ حضور ﷺ اپنی رائے کو واپس لے لیتے اور زیادہ افراد کی رائے کو ترجیح دیتے اور کبھی براہ راست کسی مسئلہ پر آپ ﷺ ریفرنڈم کرواتے تاکہ عوام کی سوچ بارے آگاہی ہوسکے اور پالیسیاں اور نظام اسی سوچ کے مطابق بنائے جائیں۔

افسوس کہ ہمارے ہاں تمام قوانین اور پالیسیاں ہماری بیوروکریسی، سرکاری افسران، وزراء دفتروں میں بیٹھ کر بناتے ہیں مثلاً دفتر میں بیٹھ کر ٹیکسز، محصولات کا نظام وضع کریں گے تو نتیجہ عوام کی طرف سے عدم اعتماد کے اظہار اور احتجاج کی صورت میں ہی نکلے گا۔ اس لئے مختلف طبقات کو قریب سے قریب لایا جائے، اکٹھے بیٹھایا جائے، اصل مسائل کو سامنے لایا جائے اور باہمی اعتماد کی فضاء پیدا کی جائے۔ جب باہمی اعتماد کی صورت میں فیصلے ہوتے ہیں تو وہ فیصلے حقیقی اور عملی ہوتے ہیں اس سے ایک بہتر فضاء پیدا ہوتی ہے۔

ناانصافی سے ہر صورت اجتناب کی تعلیم اسی لئے دی جاتی ہے تاکہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو، بے غرضی کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ خودغرضی کی کیفیت پیدا نہ ہو۔ جتنا تزکیہ نفس سرکاری افسران، حکام اور امراء کے لئے ضروری ہے شاید کسی اور کے لئے اتنا ضروری نہ ہو کیونکہ انکا تعلق براہ راست عوامی مسائل و معاملات کے ساتھ ہوتا ہے، یہ لوگ سوسائٹی کو ڈیل کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

الناس علیٰ دین ملوکھم.

" لوگ اسی راہ پر چلتے ہیں جن پر ان کے حکام، افسران چلتے ہیں"۔

جب ان کے اندر بے غرضی اور اخلاص ہو گا، دوسروں کے لئے کام کرنا ہوگا، اس بات کا احساس ان کے اندر جاگزیں ہوگا کہ ہمیں یہ منصب دوسروں کی خدمت

کے لئے ملا ہے تو بہتری خود بخود آتی چلی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے:

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، الإِمَامُ رَاعٍ، وَمَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

(بخاری فی الصحیح، کتاب: الجمعۃ، باب: الجمعۃ فی القری والمدن، ۱/۳۰۴، الرقم: ۸۵۳)

''سن لو! تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ حکمران نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے متعلق سوال کیا جائے گا''۔

حکمران، سرکاری افسر کو بطور امانت ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے جس کا مقصد عوام الناس کی خدمت کرنا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے:

سید القوم خادمهم.

(سیوطی، الجامع الصغیر، ۱:۱۵۷)

''قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے''۔

پس قوم کا سردار بھی وہی ہوگا جو ان کی خدمت کرے گا اور سرکاری افسران کا مقصد بھی یہ ہے کہ وہ قوم کی خدمت کریں۔ خدمت کرنے کا رویہ اس وقت پیدا نہیں ہوتا جب تک تزکیہ نفس نہ ہو۔۔۔ اخلاص نہ ہو۔۔۔ خدا خوفی پیدا نہ ہو۔۔۔ لالچ اور حرص سے طبیعت پاک نہ ہو۔۔۔ صدق و اخلاص پیدا نہ ہو۔۔۔ دوسروں کی خدمت کا جذبہ پیدا نہ ہو۔۔۔ عدل و انصاف اور بے عدلی اور بے انصافی کے درمیان واضح امتیاز کا شعور نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرائض کو پہچاننے اور اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

❁❁❁❁❁

الحدیث

حصہ اول

حُسنِ خلق کی دنیوی اور اخروی اہمیت

ڈاکٹر علی اکبر الازہری

حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُوْنَ قَالَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ. (سنن ترمذی، باب ما جاء فی معالی الاخلاق، ج٤، ص٣٧٠، رقم:٢٠١٨)

''تم میں سے مجھے محبوب ترین اور قیامت کے روز میرے قریب ترین لوگ وہ ہوں گے جن کے اخلاق تم سب سے اچھے ہوں گے۔ (اسی طرح) تم میں سے مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور قیامت کے دن میری مجلس سے دوری پر وہ لوگ ہوں گے جو جبڑے پھاڑ کر تند و تیز باتیں کرنے والے (چرب زبان) اور متکبر ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ہمیں ثرثارون اور متشدقون کا تو پتہ چل گیا ہے یہ تیسری قسم المتفیھقون کون ہوں گے۔ آپ نے فرمایا جو غرور و تکبر کرتے ہیں''۔

معانی و مطالب

خُلق: الخلق عبارۃ عن ھیۃ للنفس راسخۃ تصدر عنھا الافعال لبسھولہ ولیسر من غیر حاجۃ الی فکر و رویۃ. (التعریفات للجرجانی ص٩٠)

''خُلق سے مراد انسان کے وہ پختہ اوصاف ہیں جو اس کی فطرت اور طبیعت کا اس طرح حصہ بن جائیں کہ ان کا ظہور روزمرہ زندگی میں غور و فکر کے بغیر سہولت اور آسانی سے ہوتا رہے''۔

امام راغب اصفہانی کے بقول خَلق (خاء کی فتح کے ساتھ) اور خُلق (خاء کی پیش کے ساتھ) دونوں کا مادہ ایک ہے۔ خَلق ایسی مخلوق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو آنکھوں کے ساتھ دیکھی جاسکے جبکہ خُلق انسانی شخصیت کی وہ عادات ہیں جو قلب و بصیرت میں محسوس کی جاتی ہیں۔ یہ عادات دو طرح کی ہوسکتی ہیں اگر ان عادات کا اصدار عقلی اور شرعی طور پر پسندیدہ اور خوبصورت ہے تو یہ ''خُلق حسن'' کہلائیں گی اور اگر ان عادات کا ظہور عقلی اور شرعی اعتبار سے ناپسندیدہ اور معیوب ہے تو اسے خلق سیئہ کہا جائے گا جس کو بداخلاقی یا بدتہذیبی بھی کہا جاتا ہے۔

علماء لغت نے ''خُلق'' کے تحت کئی اور دلچسپ بحثیں بھی کی ہیں مثلاً جرجانی نے لکھا ہے خُلق بہر حال عادت راسخہ یعنی پختہ کردار کو ہی کہتے ہیں۔ کوئی شخص اگر وقتی طور پر کسی عارضی سبب کی وجہ سے کوئی اچھا یا برا کام کردے تو یہ اس کا خُلق نہیں کہلائے گا۔ مثلاً ایک شخص اگر وقتی طور پر اپنی ضرورت کے لئے کہیں رقم خرچ کردے تو یہ اس کی سخاوت شمار نہیں ہوگی۔ اسی طرح کسی نے اگر غصے کی حالت میں تکلفاً خاموشی اختیار کئے رکھی تو اس خاموشی کو اس کا حلم یا

برداشت نہیں کہیں گے۔ اسی طرح ''خلق'' محض فعل کے سرزد ہونے سے ثابت نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں جود وسخا موجود ہوتا ہے لیکن وہ مال کے فقدان اور تنگ دستی کے باعث سخاوت کا اظہار نہیں کر پاتے اس کے برعکس بعض لوگ طبعًا بخیل ہوتے ہیں مگر کئی مواقع پر وہ ریا اور مشہوری کے لئے مال خرچ کرتے نظر آتے ہیں لہذا اس وقتی اظہار فعل کو ہم اس کی سخاوت سے تعبیر نہیں کریں گے۔ (التعریفات للجرجانی ص ۹۱)

۲۔ الثرثارون: تیزی کے ساتھ بکثرت باتیں کرنے والے

هم الذين تكثرون الكلام تكلفا و خروجا عن الحق (النهاية فی غريب الحديث ۳۱/۲)

''یہ وہ لوگ ہیں جو بلا وجہ لمبی چوڑی اور لایعنی گفتگو کرتے ہیں یہاں تک کہ انہیں سچ اور جھوٹ کا خیال بھی نہیں رہتا''۔

۳۔ المتشدقون: جبڑے پھیلا کر بات کرنے والے

فهم المتوسعون فی الكلام من غير احتياط و احتراز وقيل اراد بالمتشدق المستهزی بالناس. (لسان العرب ۱۷۳/۱۰)

یہاں ایسے لوگ مراد ہیں جو بلا ضرورت غیر محتاط انداز سے بات کو طول دیتے ہیں۔ المتشدق اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو اپنی گفتگو میں لوگوں کا (توہین آمیز) مذاق اڑاتا ہے۔

اہم مضامینِ حدیث

حدیث مذکور کی متعدد معنوی خصوصیات ہیں مگر ہم اس کے دو اہم ترین مضامین کا تذکرہ بالترتیب کر رہے ہیں:

۱۔ روزِ محشر قربتِ محمدی ﷺ کا انعام

میدان حشر میں قیامت کی گھڑیاں اور نفسانفسی کا دور ایک ایسا ڈراؤنا منظر ہے جس کے تصور سے ہی انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ شافع محشر نبی اکرم ﷺ اس دن جہاں دیگر انبیاء اور ان کی امتوں پر گواہی دیں گے، حضور ﷺ کی اپنی امت ان کے فیضان کرم کی کہیں زیادہ منتظر ہوگی۔ اس ڈراؤنے منظر کا تصور کریں جہاں ماں، بہن، بیوی، اولاد اور دوست سب ایک دوسرے سے جان چھڑا رہے ہوں گے کوئی شخص کسی کے کام نہیں آئے گا۔ ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی۔ ہر شخص کو ایک ایک نیکی اور بھلائی کی ضرورت پڑے گی۔ ایسے میں سرور کائنات کی مجلس میں آپ ﷺ کی ہم نشینی اور قربت کی نعمت کتنے اعزاز اور فخر کی بات ہوگی۔ حضور ﷺ نے اس کرم نوازی کے استحقاق کو حسن خلق سے مشروط فرمادیا ہے اور قربت اور بخشش کو صرف اچھے اخلاق والوں کا حصہ قرار دیا ہے۔

۲۔ چرب زبانی اور تکبر کی آفت

اس حدیث مبارکہ کے دوسرے حصے میں ایسے واعظین و مبلغین، متکلمین اور عام لوگوں کے متعلق بہت سخت الفاظ میں اظہار ناپسندیدگی فرمایا گیا ہے جو گلے پھاڑ پھاڑ کر لمبی تقریریں کرتے ہیں۔ الفاظ و تراکیب کے استعمال کا فن سیکھ کر خطاب کی قیمت زیادہ سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ''آیات الٰہیہ کو بہت کم قیمت پر فروخت کرنے کا دھندا کرتے ہیں''۔ ایسے لوگوں کی اکثریت قول و فعل کے تضاد کا شکار ہوتی ہے اور معاشرے میں فتنہ و فساد پھیلانے میں زبان کا غیر محتاط استعمال ہی بنیاد بنتا ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں سے فتنہ پرور، خلاف حقائق، چرب زبانی کے جوہر دکھا کر غلط فیصلے کروانے والے اور دوغلے لوگ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے ایسے لوگوں میں وہ حضرات شامل نہیں جو اخلاص اور تڑپ کے ساتھ دین کی دعوت و تعلیم کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ ورنہ دنیا میں دین پھیلانے والا کوئی بچے گا ہی نہیں۔ ایسے ہی بے عمل واعظوں کی تیسری علامت بیان فرمائی کہ وہ مغرور اور متکبر بھی ہوں گے۔ چنانچہ عام زندگی میں یہ لوگ تکبر اور رعونت کے باعث حسن اخلاق کی

پسندیدہ خوبی سے محروم رہتے ہیں۔

حُسنِ خُلق کی معنویت

اسلامی احکام اور تعلیمات کے مقاصد و اہداف کو اگر کسی ایک عنوان کے تحت بیان کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے ''حسن خلق'' سے جامع مرکب کلمہ اور کوئی نہیں۔ دین اسلام بنیادی عقائد کے علاوہ جن اعمال کی بجا آوری سے عبارت ہے ان میں عبادات اور معاملات دو بڑے شعبے ہیں۔ عبادات میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی ہے جو اللہ اور بندے کا باہمی معاملہ اور تعلق ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس لئے ان فرض عبادات کی پابندی حقوق اللہ کی ادائیگی کہلاتی ہے۔ ان تعبدی اعمال میں سے ہر ایک کے اوقات اور اس کی شرائط و کیفیات الگ الگ ہیں۔ مثلاً روزہ جسمانی عبادت ہے مگر سال کے بارہ ماہ میں سے صرف رمضان کے روزے رکھنا فرض ہیں۔ اسی طرح حج ہے، وہ صاحبِ استطاعت پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے۔ اگر صاحب استطاعت کی تعریف موجودہ حالات میں متعین کی جائے تو یہ ہمارے ملک کے ایک فیصد پر بھی شاید صادق نہ آئے۔ مراد یہ کہ حج ایسا فریضہ ہے جو سوسائٹی کے 99% لوگوں پر کبھی فرض ہی نہیں ہوتا۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے یہ بھی سال میں ایک مرتبہ صاحب نصاب کے لئے ضروری ہے۔ صاحبِ نصاب کی تعداد بھی بمشکل ایک یا دو فیصد ہی ہوگی۔ اب ان تمام ارکان اسلام میں سے نماز ایک ایسا عمل ہے جو سوسائٹی کے بالغ مردوں اور عورتوں پر یکساں طور پر فرض ہے مگر پانچ نمازوں کے مجموعی اوقات کو جمع کیا جائے تو یہ دورانیہ بھی ایک گھنٹہ یا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے بنتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین اگر ان تعبدی اعمال کی بجا آوری کا نام ہے تو یہ ہر شخص پر ہر وقت فرض ہی نہیں حالانکہ دین تو ہماری پوری زندگی پر محیط ہے اور اس کا دائرہ کار تو معاشرے کے ہر فرد تک وسیع ہے۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ کونسا عمل ہے جو دن رات، ہر شخص کو ہر موسم میں عمر کے ہر حصے میں خواہ وہ امیر ہے یا غریب مرد ہے یا عورت پڑھا لکھا ہے یا ان پڑھ سب کو بجا لانا چاہئے یہی دائمی عمل انسان کی مستقل سیرت و کردار متعین کرتا ہے اور اسے اچھائی اور برائی کی کسوٹی سے گزارتا ہے۔ غور کیا جائے تو یہی دائمی عمل حسنِ خلق ہے۔

خُلق یا اخلاقیات کا دائرہ حقوق اللہ سے لے کر حقوق العباد کی ایک ایک جزی تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم صبح سے شام تک جہاں بھی جس سے بھی اور جو بھی معاملہ کرتے ہیں وہاں ہمارے خلق کا اظہار بہر صورت ہوتا ہے۔ وہ برتاؤ اچھا ہوگا تو حسنِ خلق بن جائے گا، برا ہوگا تو یہ اخلاق سیئہ یا بدخلقی کہلائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کی غیر معمولی اہمیت ارشاد فرمائی۔ آپ نے قیامت کے دن کام آنے والے اعمال خیر میں حسن خلق کو سب سے زیادہ قیمتی اور وزنی توشہ قرار دیا۔ حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ما من شئی اثقل فی المیزان من حسن الخلق.

''(نیکیوں کے) میزان میں کوئی چیز حسنِ خلق سے وزنی نہیں ہے''۔ (سنن ابی داؤد، ۴/۲۵۳، رقم: ۴۷۹۹)

تمام عبادات کا اصل مقصد انسان کی باطنی روحانی کیفیات میں حسن اور نکھار پیدا کرنا ہے۔ اسی باطنی حسن کے لئے قرآن و سنت میں تزکیہ اور تقویٰ کے کلمات بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ باطنی حسن اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں ہوتا جب تک کہ بندوں کے ساتھ معاملات میں حسن خُلق کا پہلو پیش نظر نہ رہے۔ کسی شخص کے محبوب بارگاہ الٰہی ہونے کے لئے صرف یہ ضروری نہیں کہ وہ شب زندہ دار ہو، صائم الدھر اور قائم اللیل ہو، ہر سال حج اور عمرے کے لئے حرمین کی حاضری دیتا ہو بلکہ یہ تو اس کی شخصیت کا صرف ایک ذاتی اور جزوی عمل ہے اور جزوی عمل کسی بھی شخص کو عظمتوں کی بلندیوں پر فائز نہیں کرسکتا۔

عبادات دین کا بمشکل 10 فیصد حصہ بنتی ہیں یا

اس سے بھی کم جبکہ دین کا بقیہ 90/ 95 فیصد حصہ مخلوق کے آپس کے معاملات پر مشتمل ہے۔ ان معاملات کا تعلق خواہ بہن اور بھائی کے مابین ہو یا میاں اور بیوی کے مابین۔ الغرض استاد اور شاگرد، افسر اور ماتحت، کارخانہ دار اور مزدور، دکاندار اور گاہک، حاکم اور محکوم، امام اور مقتدی، رعایا اور حاکم حتی کہ ماں باپ اور اولاد کے درمیان ہونے والے جملہ معاشرتی، کاروباری، سیاسی اور عائلی معاملات کی درست انجام دہی دین کے 90% حصہ کی تکمیل ہے۔ اسلام کو اسی لئے دین فطرت کہتے ہیں کہ یہ صرف انسانوں کی بنیادی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہی ہم آہنگ نہیں بلکہ انسانی معاملات میں نیک نیتی، اخلاص، ہمدردی اور خیر خواہی کو حسنِ خلق کی صورت میں انسان کی سب سے بڑی اور قیمتی متاع قرار دیتا ہے۔

حضور تاجدار کائنات نبی اکرم ﷺ نے حدیث مذکورہ بالا میں دنیوی اور اخروی کامیابیوں اور اپنی قربتوں کے لئے جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ یہی حسن خلق ہے۔

اسی طرح سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا:

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا وخیارکم خیارکم لنسائھم. (جامع ترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی استکمال الایمان، ۹/۵، رقم:۲۶۱۲)

''سب سے کامل ترین ایمان ان لوگوں کا ہے جن کا اخلاق سب سے اچھا ہے اور تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں''۔

اعلیٰ اخلاق کی اقسام

قرآن و سنت اور انبیاء و اولیائے کرام کی تعلیمات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاق عام طور پر دو قسم کا ہوتا ہے:

۱۔ ایک عام اخلاق ۲۔ غیر معمولی اخلاق

۱۔ عام اخلاق، اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ یہ فرائض، واجبات اور سنن پر کاربند رہنے والوں کو حاصل ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ نفسانی حملوں سے اپنے اعمال صالحہ کو محفوظ کرلیں۔ گناہ کبیرہ سے پرہیز پر کاربند ہوں، حرام و حلال کی تمیز رکھتے ہوں اور اپنی زبان اور قلب کو مسخر کرلیں۔ مخلوق خدا کی خیر خواہی، دین کی خدمت اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں زندگیوں کو وقف کردینے والوں کو خلق حسن کا یہ فیض نصیب ہوجاتا ہے۔

۲۔ جہاں تک تعلق ہے غیر معمولی اخلاق کا تو یہ غیر معمولی لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔

علماء نے اعلیٰ درجات کے اعتبار سے اعلیٰ اخلاق کی مزید تین اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ اخلاقِ حسنہ ۲۔ اخلاقِ کریمانہ ۳۔ خلقِ عظیم

۱۔ اخلاق حسنہ کے بھی مختلف درجات ہیں۔ عام متقی پرہیز گار لوگوں سے لے کر اقطاب وابدال اور ائمہ دین سمیت تمام پاکیزہ سیرت و کردار کے مالک صاحبانِ اخلاق حسنہ ہی ہوتے ہیں۔ انہیں فیضان نبوت میں سے حسن خلق کا فیض نصیب ہوتا ہے۔ اخلاق کے اس درجے میں عدل کا پہلو غالب رہتا ہے۔ حتی المقدور اعتدال کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۲۔ انہی اعلیٰ اور غیر معمولی اخلاق میں سے دوسری قسم ''اخلاق کریمانہ'' کی ہے، ان اخلاق کے حامل طبقات میں حضرات انبیاء، ائمہ اہل بیت اطہار اور اکابر صحابہ کرام شامل ہیں۔ تاہم انبیاء کے اخلاق کریمانہ دیگر حضرات سے منفرد ہوں گے۔ بہر حال یہ تینوں طبقات ایثار کیش لوگوں پر مشتمل ہیں۔ کسی کی زیادتی پر بھی خیر خواہی ان کا شعار ہوتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے اپنی بعثت مبارکہ کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق.

(سنن البیہقی الکبریٰ، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیہا، ۱۹۱/۱۰، حدیث:۲۰۵۷۱)

''مجھے اس لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ

ماہنامہ منہاج القرآن کے سالانہ خریداران متوجہ ہوں!

مصروفیات کی بناء پر کئی احباب ماہنامہ منہاج القرآن کی سالانہ خریداری کے دوبارہ اجراء کیلئے نہ تو مرکز آسکتے ہیں اور نہ ہی منی آرڈر کے ذریعے اپنا زرِ تعاون بھجواسکتے ہیں۔ ان احباب کی سہولت کیلئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ ماہنامہ منہاج القرآن کے جن سالانہ خریدار احباب کا زرِ تعاون جس مہینے ختم ہوجائے گا، اس سے اگلے ماہ ان احباب کو 250 روپے سالانہ خریداری کے عوض شمارہ VP کیا جائے گا تاکہ شمارہ سے استفادہ کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور انہیں بغیر تعطل کے ہر ماہ شمارہ ملتا رہے۔

امید ہے کہ آپ VP کی صورت میں ارسال کئے گئے شمارہ کو پوسٹ مین سے وصول کرکے اپنے تعاون کو جاری و بحال رکھیں گے۔ (ادارہ)

میں مکارم اخلاق کی تکمیل کرسکوں''۔

یاد رہے جو شخص جس مقام و مرتبہ کی تربیت دیتا ہے، لازم ہے کہ اس کا اپنا مقام اس سے اعلیٰ وارفع ہو۔

۳۔ کائنات انسانی میں صرف ایک ذات مصطفیٰ ﷺ ہے جن کو اللہ کی بارگاہ سے حسن خلق کا اعلیٰ ترین درجہ ''خلق عظیم'' عطا کیا گیا۔ ارشاد فرمایا گیا:

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ. (القلم:۴)

''محبوب! بلاشبہ آپ ﷺ خلق عظیم کے (اعلیٰ ترین) مرتبے پر فائز ہیں''۔

اللہ رب العزت نے یہ غیر معمولی خطاب دے کر آپ کی سیرت و کردار کو گویا عظمت و رفعت کے بلند ترین مقام پر پہنچادیا۔ اس مقام کی نمایاں خوبی مرتبۂ احسان ہے۔ گویا صاحبانِ خلقِ احسن مقامِ عدل پر فائز ہوتے ہیں۔ اخلاق کریمانہ کے حامل حضرات صاحبان ایثار ہوتے ہیں اور حضور ﷺ کے خلق عظیم کی شان یہ ہے کہ آپ کا ہر عمل مقام احسان پر فائز ہے۔

انبیاء کرام کی سیرتوں میں اگر ایثار کا پہلو غالب ہے تو اسوہ محمدی ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے جس کے ساتھ بھی جو برتاؤ کیا وہ عدل اور ایثار سے کہیں بڑھ کر ہوتا تھا۔ مثلاً مکی دور کی وہ عورت جو آپ ﷺ کے راستوں میں کانٹے بچھاتی اور نفرت کے اظہار کے لئے آپ پر کوڑا پھینکا کرتی تھی، ہر روز اس کی زیادتی پر صبر آپ کا ایثار نفس تھا۔ ایک دن اس نے یہ تکلیف دہ عمل نہ کیا تو رحمت عالم ﷺ نے اس پر شکر نہیں کیا کہ چلو جان چھوٹی، اگر آپ یہ رویہ اپناتے تو یہ عدل تھا، مگر آپ کو اللہ پاک نے جس خلق عظیم سے نوازا تھا اس کا تقاضا تھا کہ اس بدترین دشمن کے ساتھ بھی احسان کا برتاؤ فرمائیں چنانچہ آپ اس کی خبر گیری کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے۔

ایک یہودی لڑکا آپ سے محبت و احترام کا برتاؤ کرتا تھا، وہ بیمار ہوا تو آپ اس کے گھر جاکر اس کے سرہانے تشریف فرما ہوگئے اور اس کو کلمہ شہادت پڑھا کر ایمان کی سعادت سے نوازا۔

زندگی بھر جنگ و جدل میں پیش پیش رہنے والے ابوسفیان کے گھر کو فتح مکہ کے روز تباہ و برباد کرنے کا حکم فرمادیتے تو یہ عدل تھا مگر آپ نے یہاں بھی احسان سے کام لیا اور بدلہ لینے کے بجائے اسے کعبۃ اللہ کے بعد دارامن قرار دے دیا۔ محبوب چچا حضرت حمزہ کی قاتلہ ہندہ جو اب تک کفر، نخوت، عصبیت، دشمنی اور نفرت کے جذبات میں لت پت تھی، آپ ﷺ کے ساتھ مذاکرات میں بھی اس نے اپنی نفرت کا بھرپور اظہار کیا مگر جب وہ بارگاہ رسالت ﷺ سے اٹھ کر خیمہ سے باہر آئی تو اس کی زبان پر بھی حضور ﷺ کے تعریفی کلمات جاری تھے۔ اس نے کہا کہ آج تک دنیا میں سب سے زیادہ مجھے آپ سے نفرت تھی مگر اس ملاقات کے دوران خلق عظیم کا کرشمہ تھا کہ اس نے برملا اقرار کیا کہ آج کے بعد میرے لئے سب سے قابل احترام چہرہ محمد ﷺ کا ہوگیا ہے۔

الفقہ

آپ کے دینی مسائل

مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: قرآن مجید کی آیت "وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" کی صحیح تفسیر کیا ہے بعض لوگ اس سے مسلمانوں کو مشرک اور حرام خور قرار دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے وضاحت فرمائیں؟

جواب: بدقسمتی سے بعض لوگوں نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں تحریف کرنے کی کوشش کرکے جمہور مسلمانوں کی مخالفت اور عام مسلمانوں کو مشرک و حرام خور کہنے کی جسارت کی ہے جو بہت بڑا ظلم ہے۔ بہر حال میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کیے دیتا ہوں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (البقرہ، ۲:۱۷۳)

''اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سُور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے، پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے''۔

اس آیت سے مراد اولیاء اللہ اور ان کے ایصال ثواب کے لئے دی گئی نذر و نیاز قطعاً نہیں ہے بلکہ وہ جانور ہیں جن کو کفار مکہ وقت ذبح بتوں کا نام لے کر ذبح کرتے تھے۔ پس وہ حلال جانور جس کے ذبح میں اللہ کے بغیر کسی اور کا نام لیا جائے حرام ہے۔ امام نووی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں۔

وما أهل به لغير الله أي رفع الصوت عند ذبحه بغير ذكر الله. (نووی، شرح صحیح مسلم، ۸:۸۹)

''اور وہ جانور حرام ہے۔ جس کے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے''۔

علامہ ابن منظور افریقی ''اھلال'' کے معنی بیان کرتے ہیں:

ما ذبح للآلهة وذلك لأن الذابح كان يسميها عند الذبح فذلك هو الا هلال.

" جو بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے اس لیے کہ ذبح کرتے وقت ذبح کرنے والے کا ان کا نام لینا، یہی اھلال ہے''۔ (ابن منظور، لسان العرب، ۱۱:۷۰۲)

امام قرطبی لکھتے ہیں:

هی ذبيحة المجوسی و الوثنی والمعطل.

"یہ ذبیحہ ہے مجوسی کا بت پرست کا اور ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کو فارغ مانتے ہیں''۔

(قرطبی، تفسیر القرطبی، ۲:۲۲۳)

علامہ آلوسی کہتے ہیں:

أي ما وقع متلبسابه أي بذبحه الصوت

بغير الله ..... والمراد بغير الله تعالى الصنم وغيره. (آلوسی، روح المعانی، ۲:۴۲)

"یعنی جس جانور کے ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام بلند کیا جائے اور اس سے مراد بت وغیرہ ہے"۔

امام رازی فرماتے ہیں:

لأن العرب كانوا يسمون الأوثان عند الذبح ويرفعون أصواتهم بذكرها.

"عرب لوگ ذبح کرتے وقت بتوں کا نام لیتے تھے اور باآواز بلند اس کا ذکر کرتے تھے"۔

(رازی، التفسیر الکبیر، ۵:۱)

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

أي رفع به الصوت عند ذبحه للصنم.

"یعنی جس جانور کے ذبح کرتے وقت بت کا نام بلند کیا جائے"۔ (بیضاوی، تفسیر البیضاوی، ۱:۴۵۰)

پس وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے اولیاء اللہ کا غیر اللہ ہونے پر استدلال کرنا اور اولیاء اللہ کے ایصال ثواب کے لئے اللہ تعالیٰ کے لئے کی گئی نذرو نیاز کو حرام قرار دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔

سوال: بزرگان دین کے مزارات پر حاضری کے آداب کیا ہیں؟

جواب: درباروں یا مزاروں پر حاضر ہوتے وقت ان بزرگان دین کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبولیت اور قرب کے پیش نظر آداب بجا لانا انتہائی ضروری ہیں۔ لیکن ان آداب میں غُلو سے ہرصورت اجتناب برتا جائے۔ بعض نادان لوگ حالت سجدہ کے قریب ہوتے ہوئے آداب بجا لاتے ہیں جس سے اردگرد موجود لوگوں کے اذہان میں کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ یاد رکھیے اگر بطور عبادت قبر کو سجدہ کرے تو شرک خالص اور محض برکت حاصل کرنے اور صاحب قبر کی تعظیم وتکریم کے لیے سجدہ کرے تو حرام ہے۔ بعض علماء نے بوسہ دینے سے بھی محض اس لئے منع فرمایا ہے کہ بات بوسے سے سجدہ تک نہ پہنچ جائے لیکن کسی نصِ شرعی سے مزار کو بوسہ دینا حرام ثابت نہیں بلکہ بوسہ دینے کا جواز ثابت ہے۔ داؤد بن ابی صالح فرماتے ہیں:

أقبل مروان يوما فوجد رجلا واضعا وجهه على القبر فأخذ برقبته وقال أتدرى ماتصنع قال نعم فأقبل عليه فإذا هو ابوأيوب الأنصارى رضی اللہ عنہ فقال جئت رسول الله ﷺ ولم آت الحجر سمعت رسول الله ﷺ يقول لا تبكواعلى الدين اذا وليه أهله ولكن ابكوا عليه إذا وليه غير أهله. (حاکم، المستدرک، ۴:۵۶۰، رقم: ۸۵۷۱)

"ایک دن مروان آیا، پس اس نے دیکھا کہ ایک شخص نے اپنا چہرہ رسول اللہ ﷺ کی قبر انور پر رکھا ہوا ہے۔ مروان نے اسے گردن سے پکڑ کر کہا جانتے ہو کیا کررہے ہو؟ اس نے کہا ہاں جانتا ہوں۔ مروان نے غور سے دیکھا تو وہ صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ فرمانے لگے میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں کسی پتھر (بت) کے پاس نہیں آیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے۔ جب دین یعنی اسلامی حکومت کا سربراہ اہل و لائق ہوتو دین پر نہ رونا۔ ہاں جب نااہل شخص اس کا سربراہ ہوتو اس پر رونا"۔

شارح صحیح بخاری علامہ بدرالدین محمد محمود بن العینی لکھتے ہیں:

"برکت حاصل کرنے کے لیے متبرک مقامات کو اور اسی طرح نیک لوگوں کے ہاتھ پاؤں کو چومنا نیت و ارادہ کے لحاظ سے بہت اچھا اور پسندیدہ قابل تعریف عمل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ اپنی ناف مبارکہ سے کپڑا ہٹائیں جس پر رسول اللہ ﷺ نے بوسہ دیا تھا پھر آپ نے رسول اللہ ﷺ کی بوسہ گاہ اور آپ کی اولاد پاک سے برکت حاصل کرنے کے لیے اسے چوما۔

حضرت ثابت بنانی (مشہور تابعی) حضرت انس

رضی اللہ عنہ کا ہاتھ چومے بغیر نہ چھوڑتے اور فرمایا کرتے اس ہاتھ نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ مبارک کو چھوا ہے۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی قبر انور اور آپ ﷺ کے منبر شریف کو چومنے کے متعلق پوچھا گیا۔ فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہم نے یہ حوالہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کو دکھایا تو انہوں نے تعجب کیا اور کہنے لگے امام احمد میرے نزدیک جلیل الشان ہیں ہم سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی قمیض دھو کر اس کا غسالہ پی لیا۔ جب وہ اہل علم کی اس طرح تعظیم کرتے تھے تو صحابہ کرام اور اس کے آگے انبیاء کرام کے آثار وتبرکات کی کیسی تعظیم کرتے ہوں گے۔ مجنوں نے خوب کہا ہے:

امر علی الدیار دیار لیلی
اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی
ولکن حب من سکن الدیارا

''میں لیلیٰ کی بستی سے گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اس دیوار کو۔ مکانوں کی محبت نے دل کو اس طرف مائل نہیں کیا بلکہ ان مکانوں میں جو محبوب ساکن رہا اس کی محبت نے پاگل کر رکھا ہے''۔

علامہ محبّ طبری نے فرمایا: '' حجر اسود اور رکن یمانی و شامی وغیرہ کے بوسے سے بات مستنبط ہوگئی ہے کہ اللہ کی تعظیم کے لیے چومنا جائز ہے۔ بعض بزرگ قرآن کو دیکھتے تو اسے چومتے، حدیث کے اجزاء دیکھتے تو انہیں بوسہ دیتے اور بزرگوں کی قبریں دیکھتے تو ان کو چومتے''۔

(عینی، عمدۃ القاری، ۹:۲۴۱)

سوال: ایصال ثواب کی شرعی حیثیت واضح فرمادیں؟

جواب: صحابہ کرامؓ، اہل بیت عظامؓ، اولیاء کرامؒ اور اپنے آباؤ و اجداد و اعزا و اقارب کی یاد میں بپا کی گئی محافل ختم تمام ایصال ثواب کی صورتیں ہیں۔ ان

صدارتی ایوارڈ یافتہ نامور نعت گو شاعر
ریاض حسین چودھری کا آٹھواں نعتیہ مجموعہ
﴿غزل کاسہ بکف﴾
صفحات: 214
قیمت: 250 روپے
شائع ہوگیا ہے
ہر گھر اور ہر لائبریری کی ضرورت
منہاج القرآن مرکزی سیل سنٹر پر دستیاب ہے

سے منسوب خاص تاریخوں پر ایصال کرنا ضروری نہیں، جب چاہیں کرسکتے ہیں۔ یہ تعین عرفی ہے شرعی نہیں۔ یہ انتظامی سہولت کی خاطر کی جاتی ہے۔ کوئی نہ کرے تو ہم اسے برا نہیں کہتے بشرطیکہ وہ ہمارے معمولات مستحبہ کو شرک و بدعت، حرام وغیرہ نہ کہے۔

کلمات طیبات، قرآن شریف پڑھ کر، درود وسلام پڑھ کر یا صدقہ کرکے، یا کوئی نیک کام کرکے اس کا ثواب مرنے والوں یا زندہ عزیزوں کو پہنچانا سنت رسول ﷺ سے ثابت اور فقہائے کرام نے اس کے مستحب ہونے کی تصریح کی ہے۔

ان الانسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلوة أو صوما أو صدقة أو غيرها عند أهل السنة والجماعة. (مرغینانی، هداية، ۱:۲۶۳)

''اہل سنت کے نزدیک انسان کو اختیار ہے کہ اپنے نیک عمل کا ثواب دوسرے کو بخش دے۔ نماز روزہ ہو صدقہ ہو یا کوئی اور نیکی''۔

كالحج وقراءة القران والأذكار وزيارة قبور الأنبياء عليهم الصلاة والسلام والشهداء والأولياء والصالحين وتكفين الموتى وجميع أنواع البر. (شیخ نظام الدین وجماعۃ علمائے ہند، عالمگیری، ۱:۲۵۷)

''مثلاً حج، قرآن پڑھ کر، ذکر اذکار، نبیوں، شہیدوں، ولیوں اور نیکو کاروں کی قبروں کی زیارت کرکے، مردوں کو کفن پہنا کر اور ہر قسم کی نیکیاں''۔ ❁❁❁

"عجب چیز ہے لذتِ آشنائی"

حافظ ارشد اقبال

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اس کے دائرہ عمل سے لگایا جاتا ہے محبت کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اسی قدر مقبولیت اور محبوبیت میں توسیع ہو گی۔ جتنی بڑی ہستی سے محبت ہو گی اتنی رفعت و بلندی نصیب ہو گی۔ جتنے عظیم مقصد کیلئے محبت کی جائے گی اتنی عظیم قربانی کی ضرورت ہوگی۔ کائنات میں بلند ترین ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انسان کا اعلیٰ ترین مقصد اس کی رضا کا حصول ہے اس مقام رضا کے حصول کیلئے تعلق بندگی ضروری ہے اس تعلق بندگی کی تین نوعیتیں ہیں۔ ایک شخص اللہ کی عبادت یہ سوچ کر بجالاتا ہے کہ اسے عذاب جہنم سے چھٹکارہ مل سکے' ایک کا تعلق بندگی اس لیے ہے کہ اسے جنت کی پرکشش نعمتیں حاصل ہوجائیں اور ایک وہ بھی ہے جسے کسی سزا و جزا کا خیال نہیں بلکہ وہ اللہ کی عبادت وبندگی محض اسکی رضا کیلئے کرتا ہے پہلی دونوں قسم کی عبادتیں اگرچہ عنداللہ قبول ہو جاتی ہیں مگر چونکہ ان کی عبادت کا محرک خوف یا طلب ہوتا ہے اس لئے ان کو جزاء اجرت کی شکل میں چکا دی جاتی ہے لیکن رضائے الٰہی کے طالبوں کو اجرت کا طمع نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قربتِ الٰہی کے ایسے طالبوں کو اللہ تعالیٰ کی اس خالص محبت کے طفیل ایسا باطنی نور عطا ہوتا ہے کہ وہ سراپا محبت ہو جاتے ہیں اور انہیں دیکھتے ہی ہر ایک کا کوچۂ دل مہک اٹھتا ہے اور محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ گویا حدیث نبوی ﷺ کے مطابق ان کے چہرے دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔

دوسری طرف دنیا میں جہاں بھی محبت عنقا ہوتی ہے' وہاں نفرتوں اور عداوتوں کی آندھیاں خوشحالی کے ہنستے بستے گلستانوں کو ویران کرنے آجاتی ہیں۔ انسانی معاشرہ جب قتل و غارتگری، بدامنی، سیاسی و سماجی انتشار جیسے مہلک امراض کا شکار ہوجائے تو وہاں محبت کے اکسیر نسخے کے بغیر کوئی دوسرا علاج کارگر ہو ہی نہیں سکتا۔ قوموں اور ملتوں کی زندگی میں محبت کی اس بنیادی اہمیت کو حکیم الامت نے بھی تسلیم کیا ہے اور کہا:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

محبت کا مفہوم

اَلْحَبُّ وَالْحِبَّةُ گندم جَو اور دیگر مطعومات کے دانے کو کہتے ہیں اور خوشبودار پودوں اور پھولوں کے بیج کو بھی حَبٌّ و حِبَّةٌ (بکسرِ حا) کہتے ہیں قرآن حکیم کی متعدد آیات اس معنی کی تصدیق کرتی ہیں۔ مثلاً فرمانِ خداوندی ہے:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ. (البقرہ:۲۶۱)

''(راہ خدا میں خرچ ہونے والے مالوں کی)

مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگتی ہیں اور ہر بالی میں (پھر) سو سو دانے ہوں۔''

ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الحَبِّ و النَّوٰی. (الانعام:۹۵)

''بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑ نکالنے والا ہے۔''

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری محبت کے اس معنی کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ

''یہ حقیقت ہے کہ کسی درخت یا پھل کا بیج ہی اس کی اصل ہوتا ہے اور پورے پودے کا مغز بھی۔ یہی بیج دراصل اس پودے سے حاصل ہونے والا دانا ہے جو بیج کی صورت میں اس پودے کی اصل بن جاتا ہے۔ اس پودے میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی بیج کا اثر ہوتا ہے۔ یہ پودا اپنی ننھی سی کونپل سے بڑھ کر اگر ایک تناور درخت بھی بن جائے، اس پر پھل پھول لگ جائیں، الغرض اس کی شاخیں پتے اور اس درخت سے جو جو چیز بھی حاصل ہوتی ہے وہ اسی بیج کے دانے سے نکلتا ہے۔ اِس سے بھی دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس درخت کا جس طرح آغاز یعنی پیدائش اس بیج سے ہوتی ہے اور اس درخت کے پھل جب پکتے ہیں تو کھانے کے بعد آخر میں بچنے والا بھی وہ بیج ہی ہوتا ہے جس سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ گویا اس درخت کی ابتدا اور انتہا بھی وہی بیج بنا۔ اس لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بیج ہی درخت کا سارا کچھ ہوتا ہے۔'' (محبت الٰہی، ص:۵۴)

محبت کا تقاضا

اگر محبت کے لغوی معنی کو اس کے اصطلاحی معنی سے مطابقت دی جائے تو مفہوم یوں بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح دانہ اپنے وجود کو فنا کر دیتا ہے اور خاک ہو جاتا ہے اسی طرح محبّ بھی محبوب کی ذات میں فنا ہو جائے اور اصلاً یہی مقصود ہے۔ علامہ اقبالؒ اسی جانب کچھ یوں اشارہ کرتے ہیں:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

محبت فنائیت چاہتی ہے اور یہ فنائیت اپنی ہستی اور اپنی ذات کو ختم کر کے ہی حاصل ہو سکتی ہے، اگر انسان کے اندر انا باقی رہے تو حقیقی محبت کے چشمۂ صافی سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ محبت الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی جملہ خواہشات اور مرضیات کو محبوب حقیقی کی بارگاہ میں قربان کر دے۔ علامہ اقبالؒ اسی تصور کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

میں جب بھی خدا کی بارگاہ میں سجدہ کرتا ہوں تو مجھے زمین یہ کہتی ہے کہ دل کے اندر تو نے مختلف بت پال رکھے ہیں اور دن رات تو اُن کی پرستش کرتا ہے، اگر تیرا رویہ یہی رہا تو کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے اللہ کی محبت حاصل ہو۔ پہلے دل کے آئینے سے خواہشات کے گرد و غبار کو صاف کر، پھر دیکھ کہ تجھے کس طرح اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ اسی حوالے سے شیخ ابوالقاسم قشیریؒ، حضرت حارث محاسبیؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

''محبت یہ ہے کہ تو ہمہ تن کسی چیز کی طرف (جس سے محبت ہو) مائل ہو جائے پھر اپنا نفس، روح اور مال سب اس پر قربان کر دے۔ پھر ضروری ہے کہ ظاہر و باطن میں تو اس کی موافقت کرے۔' اور اسی قسم کا قول ابویعقوب سوسیؒ سے منقول ہے: ''محبت صرف اسی وقت درست ہو سکتی ہے جب محبّ اپنی محبت کی طرف نہ دیکھے بلکہ اپنی محبت کا علم مٹا کر اپنے محبوب کے دیدار کی طرف لگا رہے۔''

محبّ ہمہ وقت اپنے محبوب کی یاد میں ایسا مستغرق رہے کہ اسے دوسرے امور اپنی جانب متوجہ نہ کر سکیں۔ محبوب کا ذکر اس کی یاد اور اس کی قربت کی تڑپ

اسے دنیاومافیہا سے بے خبر کر دے۔ چنانچہ اللہ رب العزت محبت کے اسی اہم ترین تقاضے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں اور محبت کے دعویدار کے لئے ایک شرط متعین کرتے ہیں اور وہ شرط یہ ہے کہ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل:۸) ''اور اپنے محبوب رب کا نام پکارتا رہ اور سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو جا۔''

مراد یہ کہ اے خدا سے محبت کا دعویٰ کرنے والے اپنے رب کے نام کا ذکر بار بار کر۔ اسی محبوب کے نام کا تذکرہ کرتا رہ اور ہر شے سے تعلق توڑ کر مکمل اسی کی طرف متوجہ ہو جا۔ ہر چاہت سے، ہر تعلق سے، ہر رغبت سے، ہر محبت سے، ہر خواہش سے اور ہر آرزو سے اس طرح مستغنی ہو جا کہ بس اپنا تن من دھن سب کچھ اسی کی رضا کے لئے مٹانے والا بن جا۔ جب یہ کیفیت حاصل ہو جائے گی تو تو اپنے کئے ہوئے دعویٰ محبت میں سچا تسلیم کیا جائے گا اور اگر اللہ کی محبت کا دعویٰ بھی کرے اور اپنے دل میں خواہشاتِ نفسانی ، ہوسِ زر، عزت و دولت اور جاہ و منصب کی خواہشوں کے بت بھی پالتا رہے تو پھر محبت کی لذتوں اور حلاوتوں سے تجھے کیونکر شناسائی ہوسکتی ہے۔ جو محبوب کی یاد میں اپنے آپ کو محو و مستغرق کر دیتا ہے۔ محبوب کی یاد اسے حیاتِ جاوید عطا کر دیتی ہے۔ وہ حیات جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

محبت الٰہی کے اثرات

محبتِ الٰہی عقل وخرد کو لذتِ جستجو عطا کرتی ہے اور قلب و نظر کو شوقِ فراواں سے مالا مال کرتی ہے۔محبت نے ہی انسان کو خود شناس بھی بنایا اور خدا شناس بھی۔ یہی عقیدہ انسان کو آزادی وحریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے لیکن جب وہ اپنے مقام سے واقف نہیں ہوتا تو وہ دنیا کی حقیر چیزوں سے بھی ڈرتا ہے۔ حالانکہ ساری کائنات اس کی خدمت گزاری کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ اُس وقت کتنا عجیب منظر ہوتا ہے کہ ساری کائنات تو خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے اور انسان اشرف المخلوقات ہو کر بھی، کبھی چاند، کبھی سورج، اور کبھی ستاروں کے سامنے اپنی جبیں نیاز کرتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے در کا نقشِ سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہوتا ہے۔یہی انسان جب اپنی حقیقت کو پاتا ہے اور توحید کی روشنی سے اس کا دل جگمگا اٹھتا ہے تو پھر اس کا حال موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے جادوگروں والا ہوتا ہے۔ کہ پہلے تو وہ فرعون سے دنیا کے چند ٹکوں کے طالب تھے اور اب وہ سولی پر چڑھ جانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ محبت الٰہی کے اثر سے روشن سینے والا شخص اپنے باطن میں بالکل یکسو ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ آزادی کو اپنی مرضی سے اس کے ماتحت کر دیتا ہے اس کا اعلان یہ ہوتا ہے: جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (الانعام:۱۶۲)

''فرما دیجیے کہ بے شک میری نماز اور میرا حج اور قربانی (سمیت سب بندگی) اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کو کیا عطا کرتی ہے یہ سمجھنے کیلئے ذیل میں محبت الٰہی کے چند اثرات کو بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ عظمت انسان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کو اپنے نورِ ذات کا مرکز بنایا۔ جملہ مخلوقات میں سے اپنی معرفت کسی کو اس طرح عطا نہیں کی جس طرح انسان کو۔ بندہ جب اللہ سے محبت کرتا ہے تو وہ اس نورِ ذات کو پالیتا ہے جو اس کی ذات کے اندر ودیعت کیا گیا، اور یہی چیز

انسان کوعظیم بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

لَقَدْخَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین:٤)

''اور ہم نے انسان کو خوبصورت ساخت پر پیدا کیا''

اگر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ شرف کی قدر کرے تو وہ احسن تقویم ہے ۔اور انسان کا شرف یہ ہے کہ وہ نورِ الٰہی کا امین ہے اور اگر وہ اس شرف کو اپنے ہاتھوں سے برباد کردے تو وہ اسفل سافلین ہے۔ محبت الٰہی انسان کو احسن تقویم کے درجے پر فائز کرتی ہے۔

۲۔عزتِ نفس

محبت الٰہی کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے مالک کے سوا کسی اور کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا۔ اس کے جملہ مفادات اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ مفادات کی فصلیں جگہ جگہ کاشت نہیں کرتا۔ وہ اپنا دست سوال بھی کسی اور کے سامنے دراز نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وہ خود آشنا ہوجاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

خودی کا سرنہاں، لاالہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں، لاالہ الا اللہ

۳۔ عجز وانکساری

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ منکسر اور عاجز ہوتا ہے۔ عاجزی ،انکساری ،نرمی اور حلاوت اس کا شعار بن جاتا ہے۔ وہ ہرلحہ خدائے لم یزل کی خشیت سے لرزاں وترساں رہتا ہے۔ اس کی زبان پر ہر وقت یہ وظیفہ ہوتا ہے **سبحان اللہ والحمدللہ ولاالہ الا اللہ واللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم** اور وہ ہروقت اسی ذات کی قہاریت و جباریت کا اقرار کرتا ہے۔

۴۔ وسعت قلبی

جس شخص کو خدا کی محبت کا نور حاصل ہو جاتا ہے وہ تنگ ظرفی ، کمینگی اور گھٹیا پن سے یوں دور ہوجاتا ہے جیسے غسل کے بعد انسان پاک ہوجاتا ہے اور اس سے ناپاکی دور ہوجاتی ہے۔ وہ وسعت قلب کا حامل ہوتا ہے اوراللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر مومن و کافر کو عطا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کی سخاوت اور عطا بھی ہر ایک کے لیے ہوتی ہے۔ وہ متوکل اور قانع ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زبان میں اس کی زندگی کچھ ایسے ہوتی ہے۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

۵۔بے نیازی

اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اورکوئی بندہ جب اللہ سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کا یقین اپنے مالک پر کمال درجے میں ہوتا ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن اس کا یقین جیسے محبت الٰہی سے سرشار انسان کو ہوتا ہے دیگر افراد کو قطعاً نہیں۔ اسی طرح رزق کے ملنے کے وعدے کا یقین بندہ مومن سے بڑھ کر کسی کو نہیں ہوتا۔

٦۔ جذبۂ حریت

محبتِ الٰہی کا حامل مؤمن کسی کے سامنے نہ جھکتا ہے اور نہ ہی باطل سے شکست تسلیم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک باطل، جھوٹ اور طاغوت کی پیروی کا درس دیتا ہے جبکہ حق ہر باطل سے منہ موڑ کر خدائے واحد کی طرف یکسو ہونے کا نام ہے۔ وہ باطل کی ہرطرح کی غلامی سے نجات حاصل کر کے حقیقی آزادی کو پالیتا ہے۔ محبتِ الٰہی

سے سرشار فرد ظاہری اور باطنی ہر طرح کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔

۷۔تقویٰ و پرہیزگاری

محبت الٰہی کا ایک اثر گناہوں سے بچنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ داعی محبت شریعت کی حدود کے اندر رہتا ہے۔ وہ اللہ کی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتا۔ یہی صفات اسے خدا کی بارگاہ میں محبوب بناتی ہیں۔ وہ اس آیت کا حامل ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ o (الحشر:۱۸)

''اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو دیکھتے رہنا چاہئے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے آگے کیا بھیجا ہے، اور تم اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اُن کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو''۔

۸۔مخلوقِ خدا سے محبت

محبتِ الٰہی سے سرشار افراد اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ بھی محبت ومَوَدت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت و عداوت کو پیمانہ بناتے ہوئے مخلوق سے محبت و دشمنی کے رشتے پروان چڑھاتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

میری خاطر محبت کرنے والوں، میری خاطر (میری) محافل سجانے والے، میری خاطر ایک دوسرے سے ملنے والوں اور میری خاطر خرچ کرنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہوگئی ہے۔

(الموطا للامام مالک، الرقم الحدیث ۱۷۱)

اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کو اس کی بارگاہ سے اجرِعظیم ملتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا:

أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِي؟ اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّي. (صحیح مسلم، کتاب: البر والصلۃ والاداب، باب: فی فضل الحب فی اللہ، الرقم الحدیث ۲۵۶۶)

''میری عظمت کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے آج کہاں ہیں؟ میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دوں کیونکہ آج میرے سائے کے علاوہ کوئی اور سایہ نہیں ہے۔''

''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر دو بندے اللہ تعالیٰ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں (بھی) ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انہیں ضرور ملا دے گا اور فرمائے گا کہ ہے وہ (شخص) جس سے تو میری خاطر محبت کیا کرتا تھا۔''

(سنن البیہقی، الرقم الحدیث ۹۰۲۲)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے نشہ میں گرفتار شخص کے لئے دیدار محبوب اور قربِ و معرفتِ خداوندی سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ اس کو اس تعلق میں ایسا سرور و کیف میسر آتا ہے کہ وہ ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

❁❁❁❁❁

قیام پاکستان کی قوت محرکہ

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

پہلی صدی ہجری کے اختتام پر دمشق کے اموی خلفاء کے عہد میں ایک اسلامی لشکر مغرب میں سپین کی طرف بڑھتا ہے اور دوسرا مشرق کی سمت برعظیم پاک و ہند کا رخ کرتا ہے۔ عرب بیواؤں اور یتیموں پر مشتمل ایک بحری قافلہ کراچی کے قرب و جوار میں بحیرہ عرب میں سندھ کے بحری قزاقوں کے ہاتھوں لٹ جاتا ہے مگر اس وقت کا حاکم سندھ راجہ داہر نہ بیواؤں اور یتیموں کی فریاد سننے کے لئے تیار ہے اور نہ دمشق کے اموی حکمرانوں کی درخواست اور الٹی میٹم پر کان دھرتا ہے۔ اس بین الاقوامی قزاقی اور تکبر کے مظاہرہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بالآخر نوجوان مسلم سپہ سالار محمد بن قاسم ثقفی کی قیادت میں بارہ ہزار کا اسلامی لشکر ساحل سندھ و ہند پر اترتا ہے اور یوں بلادسندھ کو برعظیم کا باب الاسلام بننے کا شرف نصیب ہوجاتا ہے اور یہاں کے لوگوں کو اسلام جیسی نعمت بھی میسر آجاتی ہے۔

دوسری طرف سپین میں ایک غاصب اور ظالم کے ہاتھوں حقیقی شاہی خاندان پائمال ہوتا ہے، رعایا پر مظالم کی انتہا کردی جاتی ہے اور یہودی اقلیت پر عرصہ حیات تنگ ہوجاتا ہے۔ کچھ فریادی بچ بچا کر شمالی افریقہ میں مسلمان وائسرائے موسیٰ بن نصیر کے پاس پہنچتے ہیں چنانچہ ان مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے طریف بن مجالد کی ابتدائی یلغار کے بعد طارق بن زیاد کو بھی بارہ ہزار نفوس پر مشتمل اسلامی لشکر کی قیادت سونپی جاتی ہے۔ ایک عجیب اتفاق یہ بھی ہے کہ اپنی اپنی فوجی مہم میں ابن قاسم اور طارق کو یکساں شاندار فتح حاصل ہوتی ہے اور دونوں کا اپنوں ہی کے ہاتھوں افسوسناک انجام بھی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ تاہم ان دونوں مفتوحہ اسلامی خطوں میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

اندلس میں نہ اسلام کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور نہ مسلمانوں کو وہاں رہنے دیا جاتا ہے۔ آٹھ سو سالہ حکومت ختم ہوتی ہے تو وہاں سے اسلام اور مسلمانوں کو دیس سے نکالا مل جاتا ہے لیکن اس کے برعکس برعظیم پاک و ہند میں صورت حال مختلف نظر آتی ہے۔ حتی کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ شاندار دور حکمرانی کو ایک غیر ملکی سامراج کے ہاتھوں ختم کردیا جاتا ہے مگر پھر بھی اسلام اور مسلمان مشکلات و مصائب کے باوجود باقی رہ جاتے ہیں اور آج ڈیڑھ ہزار سال بعد بھی باقی و دائم ہیں بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی شکل میں دو آزاد مسلمان ملک بھی موجود ہیں۔ اسلامی اندلس اور مسلم ہندوستان کی یہ صورت حال کئی سوالات کو جنم دیتی ہے جن کا جواب تاریخ سے پوچھنا مسلمان محققین کا کام ہے۔

دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمان فاتحانہ داخل ہوئے مگر حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی وہاں سے

اسلام اور مسلمانوں کو بھی بے دخل کر کے نکال دیا گیا، سوائے اندلس اور سسلی کے۔ اندلس اور برعظیم ہند میں آٹھ سو سال اور ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک مسلمان حکمران رہے مگر اسلام اکثریت کا مذہب نہ بن سکا اور مسلمان اقلیت ہی رہے۔ سپین، سسلی اور برعظیم ہند میں یہی قدر مشترک ہے۔

آیئے! ان وجوہات کا جائزہ لیتے ہیں جس بناء پر اسلام ایک غالب طاقت کے طور پر اس علاقے میں دائمی سامنے نہ آسکا۔

سپین و اندلس میں مسلمان حکمرانوں کا کردار

سسلی اور سپین امویوں کے عہد میں فتح ہوئے جن کا مقصد کشور کشائی، جزیہ اور مال غنیمت تھا۔ اشاعت اسلام ان لوگوں کا ایجنڈا ہی نہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے عہد خلافت میں ایک اموی گورنر نے شکایت لکھ بھیجی کہ یہاں کے لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہورہے ہیں اور بیت المال کے لئے جزیہ کی مقدار کم ہوتی جارہی ہے، اگر یہی صورتحال رہی تو بیت المال تو خالی رہ جائے گا لہذا اجازت دی جائے کہ جزیہ دینے والا اگر مسلمان بھی ہوجائے تو اس سے پھر بھی عُشر کے بجائے جزیہ ہی وصول کیا جاتا رہے۔ حضرت عمر نے اس والی یا گورنر کو سرزنش کرتے ہوئے لکھا کہ کمبخت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام پھیلانے کے لئے بھیجا تھا نہ کہ جزیہ وصول کرنے کے لئے۔

چنانچہ خلفائے راشدین کے بعد کے مسلم حکمران فاتح اور مال غنیمت اکٹھا کرنے والے تو آتے رہے مگر اپنے کردار اور حسن اخلاق سے خلق خدا کو اسلام کی نعمت سے سرفراز کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ کسی کو بھی اشاعت اسلام اور دعوت حق کو خلوص دل اور حسن کردار سے عام کرنے کی توفیق نہیں ہوئی الا ماشاء اللہ۔ یہ فاتح جب تک طاقتور رہے، غالب رہے اور ان کا مذہب بھی ایک غالب حکمران کا مذہب متصور ہوتا رہا، کبھی وہ دشمنوں سے لڑے اور کبھی باہم دست و گریبان ہوتے رہے۔ جونہی وہ کمزور و مغلوب ہوئے تو نہ وہ خود رہے اور نہ ان کا مذہب ایک غالب حکمران کا مذہب رہا۔

اس طرح گویا ہسپانیہ، سسلی کے مسلمان حکمرانوں کا رویہ تو ایک جیسا رہا مگر سسلی اور سپین میں اسلام سے محبت کرنے والے اور خلق خدا سے پیار کرنے والے بندگان حق پرست میسر آئے۔۔۔ باہر سے بھی آئے اور یہاں بھی پیدا ہوئے، یہاں شجرہ اسلام کی کاشت اور آبیاری انہی بزرگوں کی مرہون منت ہے۔

ہسپانیہ، سسلی اور ہند کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین کی وہ شفقت اور توجہ نصیب نہیں ہوئی جو ایشیا اور افریقہ کے بیشتر مسلم ممالک کے علاوہ مشرق بعید کے اسلامی ممالک۔۔۔ انڈونیشیا، ملائیشیا اور برونائی دارالسلام وغیرہ کے حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے یہاں پر اپنے بلند اخلاق، حسن کردار اور حسن سلوک سے خلق خدا کے دل جیتے۔ یہاں اسلام کی مقبولیت فاتحین اور حکمرانوں کی کرسی اور دولت کی مرہون منت کبھی نہیں رہی بلکہ اخلاق اور کردار کے مالک بزرگ لوگوں میں گھل مل گئے اور اسلام کے اعلیٰ اخلاق اور تعلیمات نے انہیں گرویدہ بنالیا۔ یہ لوگ اقبال کے اس قول کی سچی تصویر تھے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

جنوبی ایشیاء میں مسلمان حکمرانوں کا کردار

ہسپانیہ اور سسلی کی طرح جنوبی ایشیا میں بھی غلبہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان حکمران تھے جن کی نظر صرف فتوحات پر اور مال غنیمت پر رہی اور وہ اقبال کے الفاظ میں شمشیر و سناں اول کے مرحلے کے بعد

طاؤس ور باب آخر کے مرحلے سے دوچار ہونے میں لگے رہے جبکہ ہمارے علمائے دین اور مذہبی پیشوا باہمی تفرقہ بازی اور مسلکی اختلافات میں بار بار الجھتے رہے۔ ہندو برہمن نے ان دونوں گروہوں۔۔۔ طاؤس و رباب سے دوچار حکمرانوں اور مسلکی اختلاف میں الجھے ہوئے علمائے دین۔۔۔ کی دامے درہمے خفیہ امداد جاری رکھی۔

برہمن جانتا تھا۔۔۔ اور جانتا ہے۔۔۔ کہ دین اسلام کے ابدی اصول توحید، وحدت نسل انسانی، معاشرتی مساوات اور اسلامی اخوت میں وہ صلاحیت اور کشش ہے جو اسے ہر زمانہ و ہرمکان کے انسان کے لئے قابل قبول بناتی اور بقائے دوام عطا کرتی ہے، اگر پرامن ماحول اور کھلی فضا میں اسلام کی اس صلاحیت کو کام کرنے کا موقع مل گیا تو اسے فتح اور غلبہ سے کوئی نہیں روک سکتا۔ چنانچہ مسلم حکمرانوں اور علمائے دین کی مذکورہ خدمت کرنے کے علاوہ ہندو نے ایک طرف تو مذہبی فسادات اور بدامنی کے لئے خفیہ کام جاری رکھا اور دوسری جانب مسلم فاتحین کی تازہ دم قوت سے تصادم کے بجائے ان کے سامنے بچھ کر ان کے دل و دماغ پر چھا جانے کے جتن کرتے رہے۔ اس موقع پر قدرت نے نہ صرف اورنگزیب عالمگیر کے روپ میں بقول اقبال ترکش اسلام کا آخری تیر بھیج دیا جس نے نہ صرف اکبر کے لادینی اثرات کو کافی حد تک معدوم کردیا بلکہ آنے والے وقتوں میں علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے لئے راہیں بھی ہموار کردیں۔

ظہیر الدین بابر کے ان پڑھ پوتے جلال الدین اکبر کو جو اقتدار اسلامی منتقل ہوا اس میں شیر شاہ سوری کی عظیم مدبرانہ تعمیری کوششوں کے اثرات شامل تھے، اگر وہ اورنگزیب کی طرح صاحب علم اور اسلام کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا تو اسلامی برعظیم کی تاریخ مختلف ہوتی اور اسلام یہاں کی اکثریت کا مذہب بن جاتا مگر علمائے سوء کی جاہ پرستی، خودغرضی اور دنیا داری نے اکبر کو ہندو برہمن کے خفیہ ہاتھوں میں دے دیا اور اس کی باگ دوڑ ایک گمراہ ٹولے کے سپرد کردی۔ تاہم وقت آنے پر جب بعض ہندو عمائدین سلطنت نے اکبر کا دین الٰہی ٹھکرادیا تو اس کی آنکھیں کھل تو گئیں مگر اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی اور تاریخ اپنا موڑ مڑ چکی تھی۔

ہند میں صوفیاء کرامؒ کا کردار

اس موقع پر اگر صوفیۂ صافیہ اولیاء اللہ کا وہ گروہ نہ ہوتا جو مکہ مکرمہ کے دارارقم اور مدینہ منورہ کے صفہ مسجد نبوی میں مصطفوی اسلوب تربیت سے مزین اور تبلیغ اسلام کے جذبہ نیک سے سرشار تھے تو اس بتکدہ ہند میں اسلام کی جڑیں اس طرح مضبوط نہ ہوتیں جس طرح آج ہیں۔ بے لوث اور مخلصانہ خدمت اسلام سے اس گروہ مقدس نے مسلم حکمرانوں اور علمائے دین کی کوتاہی کا تدارک کرنے کی کوشش فرمائی۔

سرزمین ہندکوتو صحابہ کرام کی قدم بوسی کا شرف بھی حاصل ہوا، تابعین بھی آئے، اسلام اور خلاق خدا کے سچے شیدائی باہر سے بھی آئے اور یہاں پر پیدا بھی ہوئے، ان بزرگوں کے ذاتی کردار، دلی اخلاص اور حسن سلوک نے یہاں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں جو قیامت تک یونہی لہراتے رہیں گے جس طرح آج لہرا رہے ہیں۔

سرکار رحمۃ للعالمین ﷺ نے دار ارقم مکہ مکرمہ اور صفہ مسجد نبوی مدینہ منورہ میں جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی رحمت و شفقت بھری نظر سے اور اپنے حسن تربیت سے سرفراز فرمایا تھا اور دنیا کو یہ پیغام دیا تھا کہ ہمہ گیر معاشرتی انقلاب کے لئے ہمہ صفت موصوف تربیت یافتہ ارکان درکار ہوتے ہیں۔ دار ارقم اور صفہ مسجد نبوی میں حبیب رب جلیل حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی نظر عنایت اور نگاہ کرم سے تربیت پاکر میدان عمل میں نکلنے والی جماعت کا ہر فرد ہمہ صفت موصوف مرد میدان تھا۔

اس منتخب جماعت نے چند سال کے اندر جہالت و پسماندگی کی انتہائی پستیوں میں ڈوبے ہوئے پورے جزیرہ عرب کا مقدر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسی لئے صرف ربع صدی کے اندر وقت کی دو سپر پاور روم اور ایران کو الٹ پلٹ کر تاریخ کا رخ بھی بدل دیا اور کئی براعظموں پر محیط ایک مثالی سلطنت قائم کردی جسے آج بھی دنیا کے اہل دانش و اہل سیاست قابل تقلید نمونہ تصور کرتے ہیں۔ اسی جماعت کے بزرگوں نے اور ان کے تربیت یافتہ تابعین نے ان کے نقش قدم پر چل کر جو دراصل رسالت مآب ﷺ کے نقوش قدم کا تسلسل تھا، صرف اپنی شفقت، اخلاص عمل اور حسن سلوک سے انسانوں کو اپنا گرویدہ اور اسلام کا شیدائی بنادیا۔

ہند کے سلاسل تصوف اور معارف طریقت اسی عملی تربیت اور نقوش قدم کے تسلسل کا نام ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے مختلف اسلامی ممالک میں امام ابوحنیفہ جیسے دانشمند فقیہہ۔۔۔ امام غزالی جیسے مفکر، صوفی و متکلم۔۔۔ اور شاہ بغداد عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ جیسے واعظ و مرشد کا وجود انہی صحابہ کرام و تابعین عظام کا ہی مرہون منت ہے۔ مگر اسلامی اندلس میں سخت گیر فقہاء، باریک بین فلاسفر، اصحاب تصانیف علماء، شعرا اور ادباء تو پیدا ہوئے اور علم و ادب سے لائبریریاں تو بھردیں مگر وہاں کوئی دور اندیش فقیہہ، حکمت دین سے آگاہ متکلم اور دلوں سے کدورتیں دور کرکے انہیں خدا شناس بنا کر باہم شیروشکر بنادینے والا کوئی ولی مرشد وصوفی پیدا نہ ہوا۔ اس کے برعکس بتکدہ ہند میں سید ہجویر وخواجہ اجمیر جیسے مرشد بھی وارد ہوئے اور اس کے ساتھ ہی گنج شکر جیسے متشرع صوفی اور مجدد الف ثانی جیسے انقلاب آفریں مرشد و صالح بھی پیدا ہوئے جو یہاں اسلام کو شجرۂ طیبہ کی مانند ایک قوت محرکہ بنا گئے۔

اسی قوت محرکہ نے تحریک پاکستان کے لئے مہمیز کا کام دیا۔ سازشیں ہوتی رہیں، مکاری کے جال تیار ہوتے رہے مگر اس قوت محرکہ کی چنگاریاں شعلہ جوالہ میں تبدیل ہوتی رہیں۔

کچھ بزرگان ملت۔۔۔ حضرت مجدد، اورنگزیب، علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح۔۔ نے اپنے اپنے وقت میں صورت احوال کو سمجھا اور آنے والے خطرات کو بروقت بھانپ کر فیصلہ کن قدم اٹھایا یہی بروقت فیصلہ کن اقدام ہی ان کی کامیابی پر منتج ہوا اور برعظیم میں ملت اسلامیہ کی بقا اور مسلسل ارتقا کی ضمانت ملتی رہی۔

مسلمان آزادئ عقیدہ اور پرامن بقائے باہمی پر ایمان رکھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ جس کی زندہ مثال وہ عزت اور آزادی ہے جو ہندوستان میں ایک ہزار سال کی حکمرانی کے دوران مسلمانوں نے ہندوؤں کو دی جبکہ دوسری طرف سے اقتدار و اختیار ملنے کے بعد اس قسم کا کوئی عملی مظاہرہ نہ اس وقت دیکھنے و سننے میں آیا اور نہ آج تک آیا۔ تقسیم ہند سے پہلے مسلمان صرف عزت، آزادئ عقیدہ اور برابر کا شہری ہونا طلب کررہا تھا اور وہ بھی آئین میں پختہ ضمانت کے ساتھ مگر ہندو قوم مسلمانوں کے اس آزادانہ مسلم تشخص کو بقا کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان میں اپنوں کی بے مہری و نادانی اور ہندو کی چیرہ دستی کے ساتھ ساتھ انگریزی سامراج بھی موجود تھا جو استعماری لوٹ کھسوٹ کے علاوہ اپنے اصلی حریف اور مدمقابل مسلمان کو جاتے جاتے آخری ضرب بھی لگانا چاہتا تھا۔ انگریز چاہتا تھا کہ وہ مسلمان کو ایک بے بس اور بے آواز اقلیت کے طور پر خونخوار ہندو اکثریت کے چنگل میں دے جائے جہاں سے نہ وہ کسی حرکت کے قابل ہو اور نہ اس کی برعظیم سے باہر کوئی آواز نکل سکے۔ ان حالات میں تمام راہیں بند تھیں اور چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف ہندی مسلمان ہی نہیں پورا عالم اسلام تین صدیوں سے مغربی سامراج کی چیرہ دستیوں

اور لوٹ کھسوٹ کی زد میں تھا۔

قیامِ پاکستان اور علامہ اقبالؒ

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اقبال اپنے فلسفہ خودی سے ملت اسلام کے مملوں کو شاہین بنانے میں تو لگے رہے اور امید کی شعلہ نوا قندیلیں بھی روشن کرتے رہے مگر ایسے میں اقبال کو ایک بڑی دور کی سوجھی جسے اپنے اور پرائے ایک خواب بلکہ مجذوب کی بڑ قرار دے رہے تھے مگر اقبال نے دیکھا کہ حضرت مجدد الف ثانی کے بعد سے تین صدیاں بیت گئیں مگر فیض اسلام کی سعادت سے بہرہ ور مسلمان سویا ہوا ہے۔ لوگ اقبال کے فلسفہ خودی کو بھی ناجائز اور حرام قرار دے رہے تھے، غلامی نے مسلمان سے جذبہ عشق چھین لیا تھا اور اب وہ بے دست و پا کھڑا تھا، اسی صورت حال کو اقبال نے شعر کی زبان دی اور کہا:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ترا فیض ہو عام اے ساقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگر دار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں ہے خالی نیام اے ساقی!

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، شب تاریک میں بھی شدت آتی جارہی تھی، ایسے میں اقبال جیسا دیوانہ چپ چاپ کھڑے ہوکر سوتے ہوئے مسلمان کو زیادہ دیر نہیں دیکھ سکتا تھا، ایسے میں جیتے جاگتے اقبال کو ایک خواب سوجھا جو پاکستان کی صورت میں تعبیر بن کر سامنے آنے والا تھا۔

حضرت علامہ اقبال نے امت راہ گم کردہ کو منزل آشنا کرنے کے لئے فیصلہ کن قدم دو مرتبہ اٹھایا۔

۱۔ خطبہ الہ آباد کی صورت میں

۲۔ برعظیم کی ملت اسلامیہ کی قیادت کے لئے قائداعظم کو لندن سے بلوانے کی شکل میں۔

ایسے حالات میں اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ، مستقل اور آزاد وطن کا مطالبہ کردیا۔

برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اکبری دور کے مسلمانوں کی حالت زار سے مختلف نہ تھی۔ اقبال اور قائداعظم کا کام نہایت مشکل تھا۔ ایک بیرونی طاقت ملک کے سیاہ و سفید کی مالک تھی، اس کے ساتھ اندرونی اکثریت اپنی عددی طاقت کے بل بوتے پر سب کچھ سمیٹنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ ایسے میں ایک کمزور سی اقلیت کے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔ انگریز و ہندو آپس میں متفق ہوچکے تھے کہ مسلم اقلیت کو کچھ بھی نہیں دینا۔ جمہوریت میں بات اکثریت کی چلتی ہے، حقیر اقلیت کو اکثریت کی حکومت کے سامنے سرتسلیم خم کرنا پڑتا ہے لہذا ہندوستانی مسلمان کا مستقبل اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ وہ ہندو اکثریت کے سامنے سر جھکادے اور بس۔ مگر ایسے میں حضرت علامہ کا یہ فرمانا کہ مسلمانوں کے لئے الگ مستقل اور آزاد وطن قائم کرنا ہوگا ایک دور کی کوڑی اور دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا مگر 1932ء سے 1947ء تک صرف پندرہ سال کے عرصہ میں یہ خواب حقیقت بن گیا۔

اقبال کا دوسرا فیصلہ کن قدم ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کے لئے قائداعظم کا انتخاب تھا۔ اقبال نے دیکھا کہ ہندو نے گورے صاحب کی زبانی جمہوریت کی حکمرانی اور جمہوریت میں اکثریت کی اصل طاقت کی لوری سن لی ہے اور وہ جھوم رہا ہے ایسے میں گورے اور اس کے لاڈلے ہندو کو جمہوریت کے ہتھیار سے شکست دی جاسکتی ہے۔ فرنگی اور ہندو کانگریس مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب مان چکے ہیں، اب اگر کوئی نڈر، بے باک، ہٹ کا پکا، بات کا سچا، عمل کا سُچا مسلمان، گورے اور ہندو

سے ان کی زبان میں بات کر سکے تو ہندو اور انگریز دونوں کو شکست دی جاسکتی ہے چنانچہ اس پکار کا جواب بلکہ وقت کی آواز کا جواب قائداعظم محمد علی جناح تھے۔

اس وقت کی مسلمان قوم کو اقبال پر پورا پورا بھروسہ تھا اس لئے اقبال نے جب مسلم قوم سے کہہ دیا کہ محمد علی جناح کی قیادت شک وشبہ سے بالاتر ہے، اس لئے پورے یقین اور عزم کے ساتھ قائداعظم کی پیروی کی جائے۔ مسلم عوام انگریزی سے نابلد تھے اور قائداعظم انگریزی میں ہی تقریر کرسکتے تھے۔ اس لئے سب لوگ اپنے قائد کو انگریزی بولتے ہوئے خوش ہوتے تھے مگر سمجھتے نہ تھے لیکن جب پوچھا جاتا تو ہر ایک کا جواب یہی ہوتا کہ قائد نے سچ ہی بولا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جو کچھ قائد نے کہا ہے ہمارا قومی مفاد اسی میں ہے۔ یہ دراصل ناقابل شکست سچائی اور غیر متزلزل اعتماد کا مزاج تھا جس نے 1947ء میں پاکستان بنادیا۔

مگر آج پھر حالات پلٹا کھارہے ہیں، مسلمانوں کو طاقت سے زیر کرنے سے اغیار مایوس ہوچکے ہیں، اب وہ مسلمانوں کو زہر دے کر نہیں بلکہ گڑ کھلا کر مارنے کی فکر میں ہے، اس مقصد کے لئے سب سے خطرناک پاکستان کی اپر سوسائٹی میں پیدا ہونے والا ''نیا سیکولر مسلمان طبقہ'' ہے جو نئی نسل کو تعلیم، تربیت، ثقافت اور ترقی کے مغربی رنگ میں رنگنے کے لئے کوشاں ہے اور اس خطے کی قدیم تاریخ کو محض عبرت یا معلومات کے لئے پڑھانے کے بجائے اس پر فخر کرنے اور اس کی عظمت کے گن گانے کے لئے پڑھوانا چاہتے ہیں۔ اس طبقہ کی بیخ کنی کے لئے آج پھر کسی احمد سرہندی، کسی اورنگ زیب، کسی اقبال اور جناح کی ضرورت ہے۔

برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ اندرونی اور بیرونی خطرات کی زد میں رہی ہے جو چودہ صدیوں سے اسے اندر سے کھوکھلا کررہے ہیں اور باہر سے اس پر مسلسل منڈلا رہے ہیں۔ اپنی بقاء اور ارتقاء کی اس مسلسل جنگ میں یہ ملت بیضاء اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور رسول اکرم ﷺ کی برکت سے بعض مخلص زعماء و مصلحین کی بروقت بیداری اور فیصلہ کن گھڑیوں میں فیصلہ کن اقدامات کے طفیل کامیابی سے ہمکنار ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ہوتی رہے گی۔ ❁❁❁❁

قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

پاکستان کا قیام تاریخ انسانی کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ مسلمانان ہند کی سال ہا سال کی قربانیوں اور قائد اعظم کی ولولہ انگیز اور بابصیرت قیادت کا ثمر تھا کہ انگریزوں کی سازشوں اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود مسلمانان برصغیر نے چند سال کی محنت کے نتیجے میں کرۂ ارض پر مدینہ طیبہ کے بعد دنیا کی سب سے پہلی اسلامی نظریاتی مملکت قائم کرنے کا معجزہ کر دکھایا۔ لیکن آج جب ہم تاریخ کے اوراق میں جھانکتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ پاکستان قائم ہونے کے باوجود ان مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہوا جو قیام پاکستان کے وقت پیش نظر تھے۔ آج ہمیں اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ قائداعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے دیگر قائدین کے پیش نظر وہ کیا مقاصد تھے جن کے حصول کے لئے اتنی طویل جدوجہد کی گئی، جس کے لئے ان گنت قربانیاں دی گئی اور ہجرت کا ایک ایسا عظیم عمل وجود میں آیا جس کی نظیر مستقبل میں بھی مشکل سے ملے گی۔

صاف ظاہر ہے ان قائدین کے پیش نظر دنیا کا کوئی حقیر مقصد نہیں ہوسکتا تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک عظیم نظریاتی، روحانی اور تہذیبی مقصد کے پیش نظر تھا۔ آج جب کہ قوم پاکستان کا 66 واں یوم آزادی منا رہی ہے یہ امر بہت اہم ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ قائداعظم کے پیش نظر پاکستان کے قیام کا مقصد کیا تھا اور ان کے تصور کے مطابق پاکستان کا نظام اور پاکستان کی قومی زندگی کی ہیئت کیا ہونی چاہیے تھی؟

دو مختلف معاشرتی نظام

قائد اعظم کے بیسیوں بیانات اور ان کی تحریریں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ ان کا تصورِ پاکستان کیا تھا؟ 22 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ہونے والا قائداعظم کا خطاب اس امر کو بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ ان کے پیش نظر ہندو مسلم اختلاف اور فرق کی نوعیت کیا تھی اور اس فرق کے نتیجے میں متحدہ ہندوستان میں وہ کون سے حالات تھے جن کے تحت مسلمان زندگی نہیں گزار سکتے تھے اور وہ اس امر پر مجبور تھے کہ ایک الگ خطہ کا مطالبہ کریں۔ قائداعظم نے اپنے اس تاریخی خطاب میں ہندو مسلم تہذیب اور قوم کے اختلافات کو بیان کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تنازعہ کوئی وقتی یا فرقہ وارانہ تنازعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی اور ثقافتی فرق ہے جس کی جڑیں مذہب میں گہری ہیں۔ آپ نے اس خطاب میں ہندو مسلم اختلافات کی اس تاریخی اور نظریاتی نوعیت کو

واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''یہ سمجھنا بہت دشوار بات ہے کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو مت کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں۔ یہ حقیقی معنوں میں مذاہب نہیں ہیں۔ فی الحقیقت یہ مختلف اور نمایاں معاشرتی نظام ہیں اور یہ ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قوم کی سلک میں منسلک ہوسکیں گے۔ ایک ہندی قوم کا تصور حدود سے بہت زیادہ تجاوز کر گیا ہے اور آپ کے بہت سے مصائب کی جڑ ہے۔ اگر ہم بروقت اپنے تصورات پر نظرثانی نہ کر سکے تو یہ ہند کو تباہی سے ہمکنار کر دے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رسم و رواج اور ادب سے تعلق ہے۔ نہ وہ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں نہ اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔ دراصل وہ دو مختلف تہذیبوں سے متعلق ہیں جن کی اساس متصادم خیالات اور تصورات پر استوار ہے۔ یہ بھی بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان تاریخ کے مختلف ماخذوں سے وجدان حاصل کرتے ہیں۔ ان کی رزم مختلف ہے، ہیرو الگ ہیں اور داستانیں جدا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہوتا ہے اور اسی طرح ان کی کامرانیاں اور ناکامیاں ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتی ہیں۔ ایسی دو قوموں کو ایک ریاست کے جوئے میں جوت دینے کا جن میں سے ایک عددی لحاظ سے اقلیت اور دوسری اکثریت ہو، نتیجہ بڑھتی ہوئی بے اطمینانی ہوگا اور آخر کار وہ تانا بانا ہی تباہ ہو جائے گا جو اس طرح کی ریاست کے لئے بنایا جائے گا۔''

یہی وہ وژن تھا کہ قائد اعظم نے جب بھی قیام پاکستان کی بات کی تو اس حقیقت کو انہوں نے شرح صدر کے ساتھ جابجا بیان کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک الگ خطہ کا مطالبہ بنیادی طور پر ایک ایسی سرزمین کے حصول کے لئے کوشش ہے جہاں وہ ایک ایسی مملکت قائم کرسکیں جس میں ان کے اپنے نظریاتی، روحانی اور مذہبی آدرش تکمیل پذیر ہوسکیں اور وہ اپنی خواہشات کے مطابق نظام کو قائم کرسکیں جس کے اندر ان کے ایمان و ایقان اور نظریات کی بقا ہے۔ قائد اعظم نے پاکستان کے قیام کے اس مقصد کو بیان کرتے ہوئے نئی دہلی میں یکم اپریل ۱۹۴۰ء کو ارشاد فرمایا:

''اس امر کے احساس ہی کی وجہ سے ہندو انڈیا کی مسلمان اقلیتوں نے آمادگی کے ساتھ قرارداد لاہور کی تائید کی تھی۔ ہندوانڈیا میں مسلم اقلیتوں کے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا نو کروڑ نفوس پر مشتمل پورے مسلم ہند پر ہندو اکثریت کا راج مسلط کر دیا جائے جہاں انہیں اپنی روحانی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کو اپنی مرضی و منشاء کے مطابق ترقی دینے اور اپنا مستقبل خود سنوارنے کا موقع حاصل ہو اور ہندوؤں اور دیگر لوگوں کو بھی یہی موقع حاصل ہو۔ مسلمانوں کے وطن میں ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کی یہی صورت حال ہوگی۔

میری رائے میں ایک فرقے کی دوسرے پر حکمرانی کرنے اور باقی ماندہ لوگوں پر اپنی برتری قائم کرنے کی خواہش کی وجہ سے جو کشیدگی پیدا ہوگئی ہے اس کے ختم ہو جانے کے بعد ہمیں ماحول میں زیادہ مفاہمت اور خیرسگالی میسر آجائے گی۔ ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے اپنے اپنے علاقوں میں اکثریت پر یہ عظیم ذمہ داری عائد ہو جائے گی کہ وہ اپنی اقلیتوں میں تحفظ کا حقیقی احساس پیدا کریں اور ان کا مکمل اعتماد اور بھروسہ حاصل کریں۔''

نظامِ ریاست کی اساس

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قائد اعظم نے جب بھی قیام پاکستان کے مقاصد کا ذکر کیا انہوں نے ان مقاصد میں نظامِ اسلام کے قیام کو مرکز و محور کے طور پر بیان کیا۔ اس سے ان کی مراد بڑی واضح تھی یعنی وہ اسلام کو بطور ایک نظام زندگی کے نافذ کرنے کی بات

کرتے تھے۔ قائداعظم نے جہاں بھی اسلام کے نظام کی یا اسلام کے نفاذ کی یا اسلام کی دی ہوئی تعلیمات کے نظام کی تشکیل کی بات کی تو اس کا مرکز و محور اسلام کا معاشرتی انصاف و عدل قرار دیا۔ آپ نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں مسلح افواج کے افسروں سے خطاب میں فرمایا:

''قیام پاکستان، جس کے لئے ہم گذشتہ دس برس سے کوشاں تھے، اللہ کے فضل و کرم سے آج ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن اپنی مملکت کا قیام دراصل ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے بذات خود کوئی مقصد نہیں۔ تصور یہ تھا کہ ہماری ایک مملکت ہونی چاہیے جس میں ہم رہ سکیں اور آزاد افراد کی حیثیت سے سانس لے سکیں۔ جسے ہم اپنی صوابدید اور ثقافت کے مطابق ترقی دے سکیں اور جہاں اسلام کے معاشرتی انصاف کے اصول جاری و ساری ہوں۔ وہ سخت کام جو ہمارا منتظر تھا اور راستہ کی وہ دشواریاں کہ جن سے ہمیں گزرنا تھا، مجھے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی تاہم میں اس بات سے تقویت پا رہا تھا کہ مجھے تمام مسلمانوں کی بے پناہ حمایت حاصل ہوگی، نیز اقلیتوں کا تعاون بھی جسے ہم منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک سے جیت سکیں گے۔''

پارلیمنٹ کا کردار

قیام پاکستان کے بعد پہلی قانون ساز اسمبلی کے اجلاس میں جب قائداعظم کو اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو آپ نے اسمبلی میں خطاب کے دوران اس کے فرائض بیان کرتے ہوئے اشارہ فرمایا کہ اس قانون ساز اسمبلی کو دو بنیادی اور تاریخی کام درپیش ہیں:

۱۔ نوزائیدہ مملکت کیلئے آئین کی تیاری

۲۔ پاکستان کے وفاقی قانون ساز ادارے کا کردار

اسمبلی کے ان فرائض کو بیان کرنے کے ساتھ آپ نے اس امر کی وضاحت بھی کی کہ ہمارا بنیادی فریضہ یہ بھی ہے کہ ہم ایسے قوانین تشکیل دیں جن سے مملکت میں امن و امان قائم ہو، لوگوں کی جان اور مال محفوظ ہو۔ قائداعظم نے اس حوالے سے موثر اقدامات کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اس مجلس کے پہلے فریضہ کے بارے میں، میں اس وقت کسی سوچی سمجھی بات کا تو اعلان نہیں کرسکتا لیکن ایک دو چیزیں جو میرے ذہن میں آئیں گی آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔ پہلی اور سب سے زیادہ اہم بات جو میں زور دے کر کہوں گا وہ یہ ہے، یاد رکھیئے کہ آپ خود مختار قانون ساز ادارہ ہیں اور آپ کو جملہ اختیارات حاصل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یعنی آپ فیصلے کس طرح کرتے ہیں؟ پہلی بات جو میں کہنا چاہوں گا وہ یہ ہے اور بلاشبہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ایک حکومت کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن و امان برقرار رکھے تاکہ مملکت اپنے عوام کی جان و مال اور انکے مذہبی عقائد کو مکمل طور پر تحفظ دے سکے''۔

سماجی برائیوں کے سدِّ باب کے اقدامات

سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے قائد اعظم نے جس سماجی برائی کا قلع قمع کرنے کی تلقین کی وہ رشوت کی لعنت ہے۔ پہلی قانون ساز اسمبلی سے ہی خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''اس وقت ہندوستان جس بڑی لعنت میں مبتلا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کے دوسرے ممالک اس سے پاک ہیں، لیکن میں یہ کہوں گا کہ ہماری حالت بہت ہی خراب ہے، وہ رشوت ستانی اور بدعنوانی ہے۔ دراصل یہ ایک زہر ہے، ہمیں نہایت سختی سے اس کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلہ میں مناسب اقدامات کریں گے جتنی جلد اس اسمبلی کے لئے ایسا کرنا ممکن ہو۔''

آپ نے مملکت کی ترقی میں حائل رکاوٹوں میں سے اقربا پروی کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ اقربا پروی کی لعنت سے نجات دلانے کے لئے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا کیا کردار ہونا چاہیے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

''میں یہ واضح کر دوں کہ میں نہ احباب پروری اور اقربانوازی کو برداشت کروں گا اور نہ ہی کسی اثر و رسوخ کو جو مجھ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ ڈالنے کی کوشش کی جائے گی، قبول کروں گا۔ جہاں کہیں مجھے معلوم ہوا کہ یہ طریقہ کار رائج ہے خواہ یہ اعلیٰ سطح پر ہو یا ادنی پر، یقینی طور پر میں اس کو گوارا نہیں کروں گا۔''

قیام پاکستان کے ساتھ ہی مملکت کو درپیش چیلنجز میں سے ایک چیلنج فرقہ وارانہ تعصّبات کا خاتمہ تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج بھی یہ چیلنج ایسے ہی سر اٹھائے کھڑا ہے جیسے کہ قیام پاکستان کے وقت تھا۔ گروہ در گروہ علاقائی، لسانی، مذہبی اور صوبائی تفریق نے آج ہمارے جسد قومی کو لخت لخت کر دیا ہے۔ قائد اعظم نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام کو مملکت کے لئے ضروری قرار دیا آپ نے اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو، ہندو رہے گا اور نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔ پس حضرات میں آپ کا مزید وقت لینا نہیں چاہتا اور ایک بار پھر اس اعزاز کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس سے آپ نے مجھے نوازا۔ میں ہمیشہ عدل اور انصاف کو مشعل راہ بناؤں گا اور جیسا کہ سیاسی زبان میں کہا جاتا ہے تعصب یا بدنیتی دوسرے لفظوں میں جانبداری اور اقربا پروری کو راہ نہ پانے دوں گا۔ عدل اور مکمل غیر جانبداری میرے رہنما اصول ہوں گے اور میں یقیناً آپ کی حمایت اور تعاون سے دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں پاکستان کو دیکھنے کی امید کرسکتا ہوں۔''

اسلام ایک عملی حقیقت

آپ نے جب بھی اسلام اور پاکستان کے تشخص کی بات کی وہ بات صرف رسمی، وقتی یا روایتی نہیں تھی بلکہ آپ نے اسے ایک عملی حقیقت کے طور پر بیان کیا۔ اسلام کے مکمل ضابطہ حیات کو بیان کرتے ہوئے قائد اعظم نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی میں عید میلاد النبی ﷺ کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''رسول اکرم ﷺ ایک عظیم رہبر تھے۔ آپ ﷺ ایک عظیم قانون عطا کرنے والے تھے۔ آپ ﷺ ایک عظیم مدبر تھے۔ آپ ﷺ ایک عظیم فرمانروا تھے جنہوں نے حکمرانی کی۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو بلاشبہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس بات کو بالکل نہیں سراہتے۔

اسلام نہ صرف رسم و رواج، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ ہے، بلکہ اسلام ہر مسلمان کے لئے ایک ضابطہ بھی ہے جو اس کی حیات اور اس کے رویہ بلکہ اس کی سیاست و اقتصادیات وغیرہ پر محیط ہے۔ یہ وقار، دیانت، انصاف اور سب کے لئے عدل کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ ایک خدا اور خدا کی توحید اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ اسلام میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں کوئی فرق نہیں۔ مساوات، آزادی اور یگانگت، اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔''

الغرض قائد اعظم کے تصور پاکستان کے وہ خدوخال جو ان کی مختلف تقریروں اور تحریروں میں جابجا بکھرے ہوتے ہیں پاکستان کا ایک ایسا جامع اور منظّم تصور پیش کرتے ہیں کہ ان کو عملی شکل دے کر آج ہم نہ

سوشل میڈیا پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے پیغام کو فروغ دیں

انگلش معلومات کیلئے: Follow TahirulQadri
اردو معلومات کیلئے: Follow TahirulQadriUR } لکھ کر 40404 پر SMS بھیجیں

www.facebook.com/TahirulQadri Like Share comment
www.twitter.com/TahirulQadri Retweet Favorite Reply

www.minhaj.org Email: news@minhaj.org

صرف جملہ چیلنجز سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں بلکہ ایک باوقار، خود گر اور ترقی یافتہ قوم کی صورت میں دنیا میں آگے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ ایک ایسی قوم جو نہ صرف اپنے معاصر چیلنجز سے عہدہ برا ہونے کی اہلیت رکھتی ہو، نہ صرف ہر لحظہ ترقی میں آگے بڑھتی ہوئی دنیا کے قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ چل سکے بلکہ اس کے ہاتھ اپنے نظریہ، اپنی شناخت اور اپنی روایات پر بھی مضبوطی سے جمے ہوئے ہوں ۔یہی وہ بنیادی نکتہ تھا جو ہمیشہ قائد اعظم کے پیش نظر رہا۔

بانی قیادت کی فکری ہم آہنگی

یہ بات بڑی قابل غور ہے کہ ہماری دو بنیادی فکری ، نظریاتی اور قومی قیادتوں حکیم الامت علامہ محمد اقبال اور بابائے قوم محمد علی جناح کے افکار اور تعلیمات میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ اس سے ہمیں آج بھی اپنے منزل کے تعین میں مدد مل سکتی ہے۔یہ ہماری بانی قیادت کی فکری ہم آہنگی تھی جس نے ہندوستان کے منتشر مسلمانوں کو ایک منظّم قوم میں بدلا جو ایک مملکت کے حصول میں کامیاب ہوئی۔ اقبال کی فکر کی اہمیت کا نہ صرف قائد اعظم کو احساس تھا بلکہ انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں یوم اقبال کی تقریب میں اپنی صدارتی تقریر میں اس کا اظہار یوں کیا:

”اگر میں اس وقت تک زندہ رہا کہ ہند میں مسلم ریاست کا حصول دیکھ سکوں اور اس وقت مجھے کلام اقبال اور مسلم ریاست کی فرمانروائی پیش کی گئی کہ دونوں میں سے ایک چن لوں تو میں بلا تامل اول الذکر کا انتخاب کروں گا۔“

آج اگر ہم ملک کے حالات اور حکمرانوں کے رجحانات اور رویوں کو قائد اعظم کے ان فرامین کی روشنی میں دیکھیں اور ان کا جائزہ لیں تو ہمیں ان میں بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ قائد اعظم ایک ایسا پاکستان چاہتے تھے جس میں لوگوں کی جان اور مال محفوظ ہو، اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہوں، رشوت ستانی ، بدعنوانی ،اقربا پروی کا خاتمہ ہو اور نسلی ،علاقائی، لسانی اور صوبائی تعصّبات کا وجود نہ ہو۔لیکن شومئی قسمت ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود ہم ان مقاصد سے کوسوں دور کھڑے ہیں جو قائد اعظم اور تحریک پاکستان کی دیگر قائدین کے پیش نظر تھے۔ آج ہمیں پھر سے پورے خلوص نیت اور استقامت عمل کے ساتھ بانیٔ پاکستان کے ان افکار و تعلیمات کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ قائد اعظم کے اس تصور پاکستان کو اختیار کر کے ہم بانیان پاکستان کی قربانیوں کا قرض بھی چکا سکتے ہیں ، اپنے حال کو پروقار بھی بنا سکتے ہیں اور اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک مضبوط ،مستحکم ، پائیدار اور ترقی یافتہ ملک کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

حقیقی سماعت اور حسنِ کلام

شفاقت علی شیخ☆

حسنِ کلام پر بات کرنے سے قبل ہمیں حقیقی سماعت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ان تقاضوں کی کماحقہ بجاآوری سے ہی حسنِ کلام سے آداب و تقاضے پورا کرنا ممکن ہوگا۔ حقیقی سماعت کا مطلب ہے کہ دوسروں کی سطح پرآ کر سننا۔ اس سے مراد ایسا سننا ہے کہ جس میں نیت سمجھنے کی ہو۔ بالفاظ دیگر دوسروں کو سننے کے دوران ہماری شدید خواہش اور بھر پور کوشش ہو کہ ہم نے دوسرے شخص کے خیالات، جذبات اور احساسات کو سمجھنا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا محسوس کر رہا ہے؟ اُس کے نقطہ نظر کو جاننا ہے کہ زیر بحث معاملہ میں اُس کی حقیقی رائے کیا ہے اور اُس کی سوچ اور فکر کا انداز کیا ہے؟ حقیقی سماعت کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اندر دوسروں کو سمجھنے کی شدید خواہش موجود ہو۔ جب تک یہ خواہش موجود نہ ہو حقیقی سماعت ممکن ہی نہیں۔ بعد ازاں ہمارے اندر اس کی صلاحیت بھی موجود ہونی چاہیے۔ اگر یہ دونوں موجود ہوں تو پھر ''حقیقی سماعت'' معرض وجود میں آتی ہے۔ خواہش کو تو ہم جانتے ہی ہیں۔ جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ''حقیقی سماعت'' ایک ہنر ہے جسے جاننے کیلئے مندرجہ ذیل تین تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ آنکھ، کان اور دل سے سننا

حقیقی سماعت کیلئے محض کانوں سے سن لینا کافی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ابلاغ کے اندر الفاظ کا حصہ صرف سات فیصد ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم دوسرے شخص کو صرف اُس کے کہے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر سمجھنا چاہیں تو ہم بہت محدود ہوجاتے ہیں۔ لہذا اگر ہم اچھے سامع بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے کانوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں اور دل کو بھی استعمال میں لانا ہوگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات، جسمانی حرکات وسکنات، آواز کے اتار چڑھاؤ اور لہجے کی مدد سے بہت ساری اَن کہی باتوں کو بھی سمجھنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ وہ واقعتاً کہنا کیا چاہتا ہے۔

۲۔ دوسرے کی دلی کیفیت پڑھنا

ہر انسان کے ذہن میں کئی قسم کے خوف، مصلحتیں اور اندیشے ہوتے ہیں جن کی بناء پر وہ سب کچھ کہہ نہیں پاتا جو اُس کے دل میں ہوتا ہے۔ لہٰذا حقیقی سامع بننے کیلئے ہمیں دوسرے شخص کے دل میں جھانکنا ہوگا اور اُس کے اندرونی جذبات سے آگاہ ہونا ہوگا۔ نیز پوری دیانتداری کے ساتھ اُس کے انداز میں سوچنا ہوگا کہ وہ کس نقطہ نظر اور کس مقام فکر سے چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔

☆ shafaqatalisheikh@yahoo.com

ورنہ ہم اُسے صحیح طور پر نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ دو اشخاص نے مختلف رنگوں کی عینکیں لگا رکھی ہوں تو دونوں کو چیزیں اپنے اپنے رنگ کے مطابق دکھائی دیں گی اور دونوں اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق بیان کر رہے ہوں گے، دونوں کے بیانات میں تضاد ہوگا مگر وہ اپنی اپنی جگہ خود کو صحیح سمجھ رہے ہوں گے۔ لہٰذا حقیقت تک پہنچنے کیلئے پہلے تو دوسرے کی عینک کے رنگ کو سمجھنا ہوگا کہ وہ کس زاویہ نگاہ سے چیزوں یا معاملات کو دیکھ رہا ہے اور پھر اپنی آنکھوں سے مخصوص رنگ (تعصّبات اور پسند و ناپسند وغیرہ) کی عینک کو اُتار کر قدرتی رنگ کی عینک سے (غیر جانبدرانہ انداز میں) معاملات کا جائزہ لینا ہوگا۔

۳۔ دوسرے کی طرح محسوس کرنا

حقیقی سماعت کا تیسرا تقاضا اپنے احساس کو دوسرے شخص کے احساس کی سطح پر لا کر اُس کی کیفیات کو خود محسوس کرنا ہے۔ پہلا تقاضا صرف دوسروں کی لفظی اور غیر لفظی زبان(verbal & non verbal language) کو غور سے سننے کا مطالبہ کرتا ہے۔ دوسرا تقاضا ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے دوسرے کے انداز میں سوچنے کی بات کرتا ہے۔ تیسرا تقاضا اس سے بھی آگے بڑھ کر دوسرے کے اُوپر بیتنے والی کیفیات کو خود اپنے اُوپر وارد کرتے ہوئے انہیں محسوس کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہاں آ کر ''حقیقی سماعت'' کا مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

مثل المؤمنين في توادهم و تراحمهم و تعاطفهم كمثل الجسد ان اشتكى عضو منه تداعىٰ له سائر الجسد بالسهر و الحمى .

(صحیح مسلم، باب تراحم، المومنین، ۴/ ۱۹۹۹، رقم: ۲۵۸۲)

'' آپس میں محبت و مودت ، رحمت و شفقت اور ہمدردی و خیر خواہی کے حوالے سے مومنوں کی مثال ایک جسم کی ہے کہ اگر اُس کے کسی عضو میں درد ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے''۔

اس حدیث مبارکہ میں بڑی خوبصورت تمثیل کے ذریعے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ دوسروں کی کیفیات کو محسوس کرنا کیا ہوتا ہے؟ پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو آنسو آنکھوں سے بہہ رہے ہوتے ہیں اور پورے جسم کا ہر عضو اس طرح بے قرار ہو جاتا ہے جیسے یہ معاملہ خود اُس کے ساتھ بیت رہا ہو۔ علامہ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اِخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستان کا ہر پیرو جواں بے تاب ہو جائے

جو بات یہاں مسلمانوں کے باہمی معاملات کے ضمن میں کہی گئی ہے وہی کچھ ہمیں ہم حقیقی سماعت کے ضمن میں بھی کرنا ہے۔ اس بات کو مزید بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ سے ایک مثال لیتے ہیں۔

حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ایک شخص زمانہ جاہلیت کی رسوم کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اُس کی ایک بچی تھی جس کو وہ زندہ دفن کرنے کیلئے گھر سے لے جا رہا تھا۔ بچی راستے میں اپنے معصومانہ انداز میں باپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ اس شخص نے ایک ویرانے میں جا کر گڑھا کھودا۔ بچی بے خبری میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس شخص نے اُسے اُٹھا کر گڑھے میں پھینک دیا۔ بچی ''ابو'' ''ابو'' کہتی رہی اور اس شخص نے اُس کی چیخ و پکار کو خاطر میں لائے بغیر اُوپر مٹی ڈال کر اُسے دفن کر دیا۔ یہ واقعہ سنانے کے بعد جب صحابی نے حضور ﷺ کے چہرہ اقدس کی طرف دیکھا تو چشمان مقدس سے آنسو جاری دکھائی دیے۔ اب یہ واقعہ کئی سال پہلے کا تھا اور اب محض اُس کی کہانی سنائی جا رہی تھی مگر حضور ﷺ اُس واقعے کو اس طرح محسوس کر رہے تھے جیسے ابھی ہو رہا ہو۔ جب تک

اُن محسوسات کو اپنے اُوپر طاری نہ کیا جائے، آنکھوں میں آنسو نہیں آ سکتے اور انسان محض اُسے ایک کہانی سمجھ کر ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔

حسنِ کلام

حقیقی سماعت کے آداب و تقاضوں کے مطالعہ کے بعد اب آیئے ''حسنِ کلام'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس طرح کسی کی بات کو سمجھنے کے لئے حسن سماعت کے آداب و تقاضے ملحوظ رکھنے پڑتے ہیں اسی طرح کسی کو اپنی بات سمجھانے کے لئے حسنِ کلام اور اس کے آداب کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ جہاں ہم دوسروں کے اندر غلطی محسوس کریں تو اُنہیں آگاہ کر دیں تاکہ وہ انہیں دور کر سکیں اور اس مقصد کیلئے اپنی بات سمجھانے کا حوصلہ ہمارے اندر ہونا ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ اَخِيْهِ.

(احمد بن حنبل فی المسند، ۲/۲۰۶، ۲۱۵، رقم: ۶۹۲۵)

''مومن اپنے بھائی کا آئینہ ہوتا ہے''

جس طرح آئینہ اپنے سامنے آنے والے کے خدوخال اور حسن و قبح بغیر کسی کمی بیشی کے اُس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور پھر اُس کی روشنی میں اُس کے لئے اپنے آپ کو بہتر بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح ہمیں بھی ایک دوسرے کی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت ایک دوسرے کی خامیوں، کوتاہیوں، غلطیوں اور لغزشوں کی نشاندہی کرنی ہوتی ہے۔ جس کے لئے دوسروں کو اپنی بات موثر انداز میں سمجھانے کے ہنر سے آشنا ہونا بہت ضروری ہے۔

اِس حوالے سے قرآن مجید نے بنیادی اُصول عطا فرما دیا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ.

(النحل:۱۲۵)

''(اے رسولِ معظّم!) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجیے جو نہایت حسین ہو''۔

یہ آیت کریمہ اگرچہ دعوت و تبلیغ دین کے حوالے سے ہے تاہم جو اُصول یہاں دیئے گئے ہیں وہی عمومی زندگی کے لئے بھی ہیں۔ یہاں ''بالحکمۃ'' اور ''موعظۃ الحسنۃ'' کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ وہ اپنے اندر حسن تکلم اور مؤثر گفتگو کے تمام لوازمات کو سموئے ہوئے ہیں۔ پھر اگلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں بھی جو بحث مباحثہ کرنا ہے وہ اتنے احسن انداز میں ہونا چاہیے کہ نوبت لڑائی جھگڑے اور تعلقات کی خرابی تک نہ پہنچ جائے۔ بلکہ اختلافات کو خوش اُسلوبی سے حل کرنا ہے۔

اپنی بات سمجھانے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ حوصلہ ۲۔ فن گفتگو سے آشنائی

حوصلے سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اندر اتنی اخلاقی جرأت موجود ہو کہ وہ دیانتداری کے ساتھ جس بات کو جس انداز میں محسوس کرتا ہے وہ دوسروں کے سامنے بیان کر سکے۔ کوئی خوف اور مصلحت اُسے اپنی رائے کے اظہار سے روک نہ سکے۔

فن گفتگو کے لوازمات

جہاں تک فن گفتگو سے آشنائی کا تعلق ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ انسان گفتگو کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آگاہ ہو اور جانتا ہو کہ مؤثر گفتگو کیسے کی جاتی ہے؟ گفتگو کے اُسلوب اور لہجے میں کن باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے؟ وہ کون سے تقاضے ہیں جن کو پورا کرنے سے گفتگو سننے والوں کے دلوں اور دماغوں کے دروازوں پر دستک دیتی چلی جاتی ہے اور اُن کے اندر

اپنے لئے قبولیت کا مادہ پیدا کرتی چلی جاتی ہے؟ اچھی اور مؤثر گفتگو کے بہت سارے لوازمات ہوسکتے ہیں تاہم اُن میں سے چند نمایاں درج ذیل ہیں :

ا۔ لہجہ میں نرمی

مؤثر گفتگو کا ایک تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے رویے میں نرمی اختیار کرے۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو ہو رہی ہوتو اُس کے لہجے میں تلخی اور شدت نہیں ہونی چاہیے ۔اللہ رب العزت نے نرمی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ دلوں کو موہ لیتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے مخاطب ہوکر فرمایا :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ.

''(اے حبیبِ والا صفات!) پس اللہ کی کیسی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم طبع ہیں اور اگر آپ تُندخُو (اور) سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے چھٹ کر بھاگ جاتے''۔(آل عمران:۱۵۹)

چنانچہ حضور ﷺ نے جو لوگوں کے دلوں کو موہ لیا تھا تو اُس کے اندر آپ ﷺ کے بہترین اور اعلیٰ درجے کے کردار کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ آپ ﷺ کا نرم رویہ بھی شامل تھا۔حضور ﷺ نے نرمی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا :

ان اللہ رفیق ویحب الرفق و یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف و ما لا یعطی علیٰ ماسواہ . (صحیح مسلم، باب الرفق، ۲۰۰۳/٤، رقم:۲۵۹۳)

'' بے شک اللہ تعالیٰ نرمی کرتا ہے اور نرمی کرنے کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ دے دیتا ہے جو کچھ سختی پرنہیں دیتا ۔ بلکہ کسی بھی اور طرح سے نہیں دیتا''

گفتگو کے اندر نرمی کی صفت کو اپنانا کس قدر اہم اور ضروری ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ جب اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون کی طرف دعوت توحید دے کر بھیجا تو چلتے وقت دونوں کو نصیحت فرمائی :

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى. (طٰهٰ:٤٤)

''سوتم دونوں اس سے نرم (انداز میں) گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرلے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے''

آج نہ تو کوئی بھی قائل (بات کرنے والا) حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے بہتر ہے اور نہ ہی اُس کا مخاطب (جس سے گفتگو کی جارہی ہو) فرعون سے بدتر ہے ۔لہٰذا ہمیں ہر قسم کے حالات، ہرکسی کے ساتھ اور ہر قسم کی گفتگو میں جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنے رویے میں نرمی، ملائمت اور شیریں بیانی کو برقرار رکھنا چاہئے۔

۲۔ گفتگو میں ٹھہراؤ

اچھی گفتگو کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس میں بہت زیادہ تیزی اور جلدی نہیں ہوتی بلکہ الفاظ کو بڑے سکون ، وقار اور اطمینان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے ،جس کا سماعت پر بہت خوشگوار اثر پیدا ہوتا ہے ۔ گفتگو کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر الفاظ تیزی تیزی سے ادا کیے جا رہے ہوں تو ایک طرف تو سننے والے کو سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف بولنے والے کا تاثر (image) خراب ہوجاتا ہے لہٰذا گفتگو میں ٹھہراؤ کا ہونا بہت ضروری ہے ۔حضور ﷺ گفتگو میں اس نکتے کو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :

کان کلام رسول اللہ ﷺ کلاماً فصلاً یفھمہُ کل ما سمعہ. (سنن ابی داؤد، باب فی الخطبة، ٢٦١/٤، رقم:٤٨٣٩)

’’ رسول اللہ ﷺ کا کلام وقفہ دار ہوتا ، سننے والا ہر بات سمجھ لیتا تھا ‘‘۔

ایک دوسری روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہی یوں منقول ہے:

ما کان رسول اللہ ﷺ یسترد سرد کم ھذا ولکنہ کان یتکلم بکلام بینہ فصل یحفظہ من جلس الیہ . (سنن الترمذی، باب فی کلام النبیؐ، ۵/۶۰۰، رقم:۳۶۳۹)

’’رسول اللہ ﷺ کی گفتگو تم لوگوں کی طرح لگا تار جلدی جلدی نہیں ہوتی تھی بلکہ صاف صاف مضمون دوسروں سے ممتاز ہوتا تھا کہ پاس بیٹھنے والا یاد کر لیتا ‘‘۔

ایک بار حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تیزی سے کوئی حدیث بیان کرنا شروع کی ، اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ساتھ والے حجرے سے سن رہی تھیں ،آپ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس طرح بات کرنے سے روکا اور فرمایا:

کان رسول اللہ ﷺ لیحدث الحدیث لو شاء العاد ان یحصیہ احصاہ . (سنن ابی دائود، باب الکلام فی کتاب اللہ بغیر علم، ۳/۲۳۰، رقم۳۶۵۴)

رسول ﷺ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تھے کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ گننا چاہتا تو گن سکتا تھا‘‘۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ہے کہ اہم بات کو دہرا دیا جائے تا کہ مخاطب کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

کان رسول اللہ ﷺ یعید الکلمۃ ثلا ثًا لتعقل عنہ (سنن ترمذی، باب فی کلام النبیؐ، ۵/۶۰۰، رقم:۳۶۴۰)

’’رسول اللہ ﷺ بات کو تین مرتبہ دہراتے، تا کہ اُسے سمجھ لیا جائے‘‘۔

لہٰذا دوسروں کو اپنی بات اچھی طرح سمجھانے کیلئے گفتگو میں ٹھہراؤ ہونا نیز اہم بات کو سننے والے کی سہولت کیلئے دہرا دینا بھی خوشگوار اثرات کا حامل ہوتا ہے

۳۔ گفتگو میں اختصار

گفتگو کے اندر حسن اور جاذبیت پیدا کرنے والی ایک اور چیز گفتگو میں اختصار کرنا ہے۔ یعنی گفتگو کو خوامخواہ اتنا طویل نہ کیا جائے کہ سننے والے کی طبیعت بوجھل ہو جائے اور اُس کے اندر اُکتاہٹ پیدا ہونے لگے۔ ایسی صورت میں اثر انگیزی کم ہو جاتی ہے۔ لہذا گفتگو کو اتنا ہی ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعے سے بات بھی دوسرے کی سمجھ میں آجائے اور اس پر کسی قسم کا نا خوشگوار اثر بھی نہ پڑے ۔حضور ﷺ نے غیر ضروری طو یل گفتگو کو نا پسند فرمایا۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

امرت ان اتجوز فی القول فان الجواز ھو خیر (شعب الایمان، کلام ابن ادم امر لمعروف او نھی عن المنکر، ۴/۲۵۲، رقم:۴۹۷۵)

’’ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں ، کیونکہ اختصار بہترین ہے‘‘۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کی نصیحتیں بھی اکثر و بیشتر ایک دو جملوں پر مشتمل ہوتی تھیں ۔ بڑے بڑے اہم سوالات کے جوابات بھی آپ ﷺ نے چند الفاظ یا جملوں میں بیان فرما دیئے۔یہ تو خیر رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

اُو تیت جوامع الکلم. (صحیح مسلم، کتاب المساجد مواضع الصلاۃ، ۱/۳۷۲، رقم:۵۲۳)

’’ مجھے جوامع الکلم (کا معجزہ) عطا کیا گیا ہے‘‘۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے کہ میں چند الفاظ میں زیادہ مفہوم بیان کر سکتا ہوں ۔ہمیں بھی

اپنی روزمرہ گفتگو میں (اپنے امکان کی حد تک ہی سہی) اختصار سے کام لینا چاہیے۔ عربی زبان کا ایک قول ہے

خیر الکلام ماقل و دل.

'' بہترین کلام وہ ہے جو (الفاظ میں) تھوڑا ہو اور (زیادہ معنی پر) دلالت کرے''۔

اس سے ملتا جلتا قول انگریزی زبان میں یوں ہے

Breavity is the soul of Wit

'' اختصار گفتگو کی جان ہے''۔

لہٰذا گفتگو میں اختصار کرنا چاہیے تا کہ اُس کے اندر حسن پیدا ہو لیکن اتنی مختصر بھی نہ ہو کہ مخاطب کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہم کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ میانہ روی ہی بہترین ہے ۔حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

خیر الامور ا و سطھا. (تفسیر ابن ابی حاتم، ۲۷۲۷/۸)

''بہترین کام میانہ روی ہے''۔

۴۔ مخاطب کی نفسیات کا لحاظ

کامیاب اور موثر گفتگو کیلئے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مخاطب کی نفسیات کو سمجھیں اور اُسے ملحوظ خاطر رکھ کر گفتگو کریں ۔ مخاطب کی ذہنی سطح ،علمی استعداد، عقل وفہم کا معیار، اُس کا ذوق ، مزاج اور رجحان وغیرہ جیسی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کی جائے تو اُسے جلدی سمجھ میں آجاتی ہے اور اگر ان چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو نتائج حوصلہ افزا نہیں ملتے ۔حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ:

کلموا الناس علی قدر عقولھم.

'' لوگوں کے ساتھ اُن کی عقل کے مطابق گفتگو کرو''۔

مثال کے طور پر ایک پرائمری شخص کے ساتھ Ph.D سطح (level) کی گفتگو شروع کر دی جائے تو گفتگو کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو نتیجہ صفر ہی نکلے گا۔

۵۔گفتگو کو مؤثر دلائل سے مزین کرنا

پُر اثر گفتگو کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جہاں ضروری اور مناسب ہو ہم اپنے موقف کے حق میں ٹھوس اور مضبوط دلائل پیش کریں تا کہ بات میں وزن پیدا ہو اور سننے والے کیلئے اُسے سمجھنا اور قبول کرنا آسان ہو جائے۔ یہ دلائل قران مجید کی آیات ، احادیث مبارکہ اور مشاہیر کے اقوال ہو سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں روزمرہ زندگی کی عقلی مثالوں ، تجربات و مشاہدات، استعارات اور تشبیہات سے بھی حسب ضرورت کام لیا جا سکتا ہے۔ حضور ﷺ وقتاً فوقتاً بات کو سمجھانے کیلئے ان ساری چیزوں سے کام لیتے رہے ہیں اور خود قران مجید میں اللہ رب العزت نے بھی جا بجا مختلف قسم کی مثالوں کا استعمال کیا ہے اور لوگوں کو غور وفکر اور عقلی استدلال کو استعمال کرنے کی تاکید فرمائی ہے ۔ چنانچہ جب اس حوالے سے کافروں نے اعتراض کیا تو اللہ رب العزت نے جواب یوں دیا ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا. (البقرہ:۲۶)

'' بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ مچھر کی مثال دے یا اس سے بھی کم تر چیز کی''۔

لہٰذا گفتگو کو زیادہ مؤثر اور جاندار بنانے کیلئے اُس میں حسب ضرورت عقلی ونقلی دلائل کا استعمال ضروری ہے۔

۶۔غلطی کی نشاندہی میں حکیمانہ اُسلوب اپنانا

بعض اوقات ہمارا مخاطب غلطی پر ہوتا ہے اور ہمیں اُس کی غلطی کی نشاندہی کرنا ہوتی ہے ۔ یہ بہت نازک موقع ہوتا ہے ۔ ہماری ذرا سی غلطی معاملے کو بگاڑ سکتی ہے اور دوسرے کے ذہن کو منفی رُخ پر چلاسکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں عین ممکن ہے کہ وہ اُسے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ڈٹ جائے اور اصلاح کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہو ۔ لہذا یہاں ہمیں حکیمانہ اُسلوب اپنانا ہوگا جس کیلئے مندرجہ ذیل دو باتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے ۔

ا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے

پوچھیں میری یہ بات دوسرے کی واقعی مدد کرے گی یا میں محض اپنی اہمیت جتانے کیلئے ایسا کر رہا ہوں اور اپنی انا کی تسکین کیلئے دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ اگر ایسا ہے تو رُک جائیں ۔ایسی نصیحت دوسرے کو فائدہ دینے کی بجائے اُلٹا نقصان پہنچا سکتی ہے ۔اصلاح کا کام تو اُس وقت بار آور ہوتا ہے جب اُس کی تہہ میں ہمدردی وخیر خواہی کا چشمہ اُبل رہا ہو۔

۲۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ غلطی کی نشاندہی ایسے الفاظ میں کی جائے کہ دوسرے کو بُرا محسوس نہ ہو اُسے خود اُس کی اپنی اور دوسروں کی نظروں میں شرمندگی اور رسوائی سے بچایا جائے ۔ اس مقصد کیلئے الفاظ کا انتہائی محتاط استعمال بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ ہی ہیں جو پٹرول کا کام دیتے ہیں کہ آگ لگا دیتے ہیں اور وہ بھی الفاظ ہی ہیں جو پانی کا کام دیتے ہیں اور لگی ہوئی آگ کو بجا دیتے ہیں ۔ الفاظ سے آگ کا کام لینا ہے یا پانی کا، اس کا انحصار بولنے والے پر ہے کہ وہ اُنہیں کس طرح سے اور کن معنوں میں استعمال کرتا ہے ۔ ہمارے ہاں اس بات کو سمجھانے کیلئے ایک مشہور مثال دی جاتی ہے کہ اگر کسی گنجے کو کہا جائے کہ '' آپ گنجے کیسے ہوئے '' تو اُس پر کوئی اور اثر ہو گا اور اگر پوچھا جائے کہ '' آپ کے سر کے بال کیسے جھڑے '' تو اُس صورت میں کوئی اور اثر ہو گا حالانکہ دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے لیکن الفاظ کے چناؤ (selection) نے اثرات میں فرق پیدا کر دیا۔ لہذا ہمارے لئے روزمرہ کی زندگی میں بالعموم اور دوسروں کی غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے بالخصوص الفاظ کے استعمال میں انتہائی محتاط ہونا بہت ضروری ہے ۔

تعلقات کی بحالی ۔۔۔۔ اولین ترجیح

حسن سماعت اور حسن کلام کا آپس میں گہرا تعلق دوسروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں ممد و معاون ہے۔ یہ ایک طرف تو سماجی زندگی کی اولین ضرورت ہے اور دوسری طرف ہماری تمام تر ترقیوں ، کامیابیوں اور کامرانیوں کا دارومدار بھی خوشگوار تعلقات پر ہے کیونکہ اسی طرح ہمیں دوسروں کی طرف سے وہ مطلوبہ تعاون میسر آ سکتا ہے جو کسی بڑے معرکے کو سر کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے ۔ اس ضمن میں یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ اگر ہمارے اپنے متعلقین میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلقات خراب ہو جائیں تو ہمیں پہلی فرصت سے بھی پہلے بالمشافہ ملاقات کے ذریعے بات چیت کر کے افہام وتفہیم کے ذریعے تعلقات کو معمول پر لے آنا چاہئے ۔اس حوالے سے غفلت آگے چل کر سنگین نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے ریل کی پٹڑی کا کانٹا جب بدلتا ہے تو ابتداء میں فاصلہ چند انچ کا ہوتا ہے لیکن آگے چل کر یہی فاصلہ میلوں میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ کچھ ایسا ہی معاملہ باہمی تعلقات کا بھی ہے اگر باہمی رنجشوں ،گلوں، شکووں اور غلط فہمیوں کو بروقت دور نہ کر لیا جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رائی کا پہاڑ بنتا چلا جاتا ہے اور محبت کو نفرت میں اور دوستی کو دشمنی میں بدل ڈالنے کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔

ہم میں سے ہر شخص کو حسن سماعت وحسن کلام کے آداب و تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے درج ذیل اقدامات ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سننے کیلئے دو کان اور بولنے کیلئے ایک زبان عطا فرما رکھی ہے ۔ لہذا ہمیں ان کی اہمیت و ضرورت کے مطابق دانشمندانہ طور پر استعمال میں لانا چاہیے۔ نہ تو ان کا غلط استعمال (Miss use) کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کا کمتر استعمال (Under use) کرنا چاہیے۔

۲۔ کسی فارغ وقت میں بیٹھ کر غور کریں کہ آپ کا زیادہ وقت بولنے میں صرف ہوتا ہے یا سننے میں ۔پھر اس حوالے سے مناسب تبدیلی لائیں ۔کوشش کریں کہ

بولنے کی نسبت سننا زیادہ ہو۔

۳۔ سننے کے پانچ ناقص انداز (جن کا ہم مضمون کے پہلے حصہ میں مطالعہ کرچکے ہیں) پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہمارے اندر کون سا انداز پایا جاتا ہے اور اُس میں بہتری لانے کیلئے کیا کیا جاسکتا ہے؟

۴۔ جب لوگ باتیں کر رہے ہوں تو اُن کے الفاظ کو توجہ سے سننے کے ساتھ ساتھ اُن کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات وسکنات کو بھی غور سے دیکھا کریں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس انداز سے کہہ رہے ہیں؟ اُن کے جسم کی زبان (Body language) کس حد تک اُن کے الفاظ کی تصدیق اور تردید کر رہی ہے۔ اس کام کو اکتاہٹ اور بیزاری سے کرنے کی بجائے دلچسپی اور تجسس سے کریں۔

۵۔ کسی ایسے تعلق کا انتخاب کریں جس کے ساتھ آپ کا رابطہ تقریباً ختم ہو چکا ہو اور معاملات سرد مہری کا شکار ہو چکے ہوں۔ ہر قسم کے تعصّبات سے اُوپر اُٹھ کر غور کریں کہ آپ نے اُس کو سننے اور سمجھنے میں کہاں کہاں غلطی کی اور اُس کا ازالہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ ہو سکے تو اُس کے ساتھ ایک نشست رکھ کر اُن غلطیوں کی تلافی کریں۔ اُسے سمجھنے کی نیت سے غور سے سنیں۔ نتائج حیران کن ہوں گے۔

۶۔ اپنی گفتگو کے انداز کا بغور جائزہ لیں کہ آپ کیا کہتے ہیں اور کس انداز میں کہتے ہیں۔ گفتگو کی رفتار، آواز کے اُتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ میں کون کون سی خامیاں اور کمزوریاں ہیں جو گفتگو کی اثر انگیزی کو متاثر کر دیتی ہیں۔ اُن غلطیوں کو کوشش، محنت اور استقلال کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کریں۔

❁❁❁❁❁

اظہار تعزیت

گذشتہ ماہ محترم امیر خان نیازی (سیکورٹی انچارج مرکزی سیکرٹریٹ) کا جواں سالہ بھتیجا (میانوالی) اغواء کے بعد قتل کر دیا گیا، محترم محمد اقبال (یونان) کی پھوپھو جان، محترم غلام فرید (یونان) کے کزن، محترم راجہ محمد حنیف (سٹوڈنٹ کالج آف شریعہ) کی نانی جان، محترم افتخار احمد بھٹی (سکھیکی منڈی حافظ آباد) کے ماموں چوہدری اسلم حیات بھٹی، محترم بشیر احمد گجر (مریدکے)، محترم محمد عمران علوی (مریدکے) کی زوجہ محترمہ، محترم محمد شہباز قادری (مریدکے) کا بھتیجا، محترم محمد رزاق نظامی (پھول نگر، قصور) کی والدہ محترمہ، محترم محمد اکرم نیازی (جڑانوالہ) کی والدہ محترمہ، محترم چوہدری تصدق حسین (دیپال پور) کے والد محترم، محترم مظہر حسین قادری (کشمیر) کے والد محترم، محترم محمد سلیم قادری (راجن پور)، محترم میاں نثار احمد (سیالکوٹ) کی والدہ اور بہنوئی، محترم محمد ندیم (سیالکوٹ) کے بہنوئی، محترمہ باجی فہمیدہ (سیالکوٹ) کے والد محترم، محترم محمد عامر یوسف (منہاج پروڈکشن) کے ماموں جان، محترم محمد ریاض گھمن (سیالکوٹ) کے ماموں جان، محترم مقبول حسین قادری (بجوات۔ سیالکوٹ) کے والد محترم، محترم محمد مشتاق رفیق (سیالکوٹ) کی والدہ محترمہ، محترم یاسر پہلوان (سیالکوٹ) کے والد محترم اور محترم شیخ زاہد محمود (بجوات، سیالکوٹ) کے چچا جان قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ جملہ مرحومین کی بخشش ومغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

پاکستان عوامی تحریک کے زیر اہتمام

عوامی دادرسی سیل کی تشکیل نو

سرکاری محکمہ جات، عدالتوں، تھانوں اور جیلوں سے متعلقہ عوامی مسائل و مشکلات کے حل کیلئے انقلابی اقدام

ڈاکٹر مشتاق احمد عباسی، صوبائی ناظم تربیت

پاکستان عوامی تحریک شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی قیادت، راہنمائی اور ہدایات کی روشنی میں سیاسی، سماجی و اقتصادی احوال کی اصلاح، نظام کی تبدیلی، عوامی شعور کی بیداری، انسانی حقوق و رفاہ عام، عوامی مسائل کو اجاگر کرنے اور ان کے حل تجویز کرنے، مزدوروں، کسان اور مظلوموں کے حقوق کے تحفظ، تحفظ حقوق نسواں اور بدعنوانی کے خاتمہ کے لئے سیاسی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ ملکی، قومی و عوامی ایشوز پر پاکستان عوامی تحریک قوم کی حقیقی آواز بن کر آل پاکستان پارٹیز کانفرنسز، قومی سیمینارز، جلسوں، عظیم الشان اجتماعی ریلیوں، ملک گیر مظاہروں، اور پرنٹ و الیکٹرونک میڈیا کوریج کے ذریعے قومی مسائل اور ان کے حل کو اجاگر کرنے میں مصروف عمل ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری نے مصطفوی انقلاب کی منزل کے حصول کے لئے ایک کروڑ کارکنان کی تیاری کا حکم فرمایا ہے۔ اس ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لئے مختلف سرگرمیاں، منصوبے اور طریقے استعمال کئے جائیں گے جن کے ذریعے عوام الناس کے ساتھ رابطہ مضبوط کیا جائے گا اور انہیں قافلہ انقلاب میں شامل کیا جائے گا۔ اس کا ایک ذریعہ ’’عوامی دادرسی سیل‘‘ کے نام سے پلان کیا گیا ہے۔ پاکستان عوامی تحریک کے تحت فیلڈ میں ’’عوامی دادرسی سیل‘‘ کے نام سے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے گا، مظلوم کا ساتھ دیا جائے گا، ان کے ساتھ تھانہ کچہری میں جایا جائے گا۔ فریقین کے درمیان صلح جوئی کی کوشش کی جائے گی۔ ’’عوامی دادرسی سیل‘‘ کا تفصیلی پلان حسب ذیل ہے:

سرکاری محکمہ جات، عدالتوں، تھانوں اور جیلوں سے متعلقہ عوام الناس کے مسائل اور مشکلات کے حل کیلئے پارٹی میں ہر سطح پر دادرسی کرنا پاکستان عوامی تحریک کے ذمہ امور میں شامل ہوگا۔

1۔ عوامی دادرسی سیل کا تنظیمی نظم

’’عوامی دادرسی سیل‘‘ کو چلانے کی ذمہ دار تحصیل اور ضلع سطح کی پاکستان عوامی تحریک کی تنظیمات ہوں گی۔ فی الحال سیل کو چلانے کیلئے کوئی الگ سے عہدیدار نہیں بنائے جائیں گے۔ البتہ سیل کو مؤثر طریقے سے چلانے کیلئے ہر تحصیل اور ضلع سے مؤثر افراد شامل کئے جائیں گے تاکہ سرکاری محکمہ جات، عدالتوں، تھانوں اور جیلوں میں ان مؤثر اور متعلقہ افراد کے ذریعے مسائل کے حل کیلئے پیش رفت ہوسکے۔

پاکستان عوامی تحریک کے پلیٹ فارم سے کی جانے والی دادرسی کی بنیادی ذمہ داری PAT کی تنظیمات کی ہوگی لیکن ہر سطح پر تحریک منہاج القرآن اور اس کے جملہ فورمز کی تنظیمات اس کام میں PAT کی معاونت کریں گے۔

مرکز اور صوبہ اس کام میں تحصیلی اور ضلعی تنظیمات کو بھرپور معاونت اور رہنمائی فراہم کرے گا۔

مسئلہ کو پہلے تحصیل وضلع سطح پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔اگر پھربھی مطلوبہ پیش رفت نہ ہو تو پاکستان عوامی تحریک کی صوبائی تنظیمات سے مدد و رہنمائی لی جائے گی ۔

2۔عوامی دادرسی سیل کی ذیلی شاخیں

☆عوامی ڈیرہ (پارٹی دفتر) ☆عوامی ویلفیئر فورم
☆عوامی ایکشن کمیٹی (برائے سرکاری و بلدیاتی محکمہ جات / کونسلو) ☆عوامی لیگل ایڈ فورم

3۔مؤثر افراد سے خصوصی رابطے

عوامی دادرسی سیل کی مؤثریت کو یقینی بنانے کے پیش نظر درج ذیل افراد کو ساتھ شامل کیا جائے گا:

☆وکلاء ☆ریٹائرڈ پولیس آفیسر ☆ریٹائرڈ سرکاری آفیسر ☆ریٹائرڈ فوجی آفیسر
☆ریٹائرڈ بنک آفیسر ☆سابقہ ایم این اے، ایم پی اے، ناظم، کونسلر، نمبردار ☆تاجر رہنما
☆ فلاحی و دینی تنظیمات کے عہدیداران ☆خواتین رہنما ☆علاقہ کے دیگر موثر افراد

ان افراد سے مسلسل رابطہ اور تعلقات کار بہتر بنا کر اپنے علاقہ کے انفرادی و اجتماعی مسائل کے حل کی کوششوں کو بارآور بنایا جاسکتا ہے ۔

4۔عوامی دادرسی سیل کی جدوجہد کے ذریعے ممبر سازی مہم

عوامی دادرسی سیل کی جدوجہد کے ذریعے پارٹی کیلئے ممبر سازی مہم کو شاندار اور نمایاں کامیابی سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کیلئے یہ ممبران پارٹی کے دست و بازو بن سکتے ہیں۔

5۔عوامی دادرسی کے اغراض و مقاصد

☆ تحریک کے وابستہ افراد کے انفرادی اور اجتماعی مسائل حل کروانا ۔
☆ مظلوم، بے سہارا اور غریب عوام کی مسائل کے حل میں اُن کی معاونت کرنا۔
☆ سرکاری محکموں، تھانوں، عدالتوں، یونین کونسلوں اور جیلوں سے متعلقہ مسائل حل کروانا۔
☆ متعلقہ علاقہ کیلئے ترقیاتی پراجیکٹس شروع کروانے کیلئے سرکاری محکموں، ہیلتھ سنٹرز، ممبران پارلیمنٹ، بلدیاتی محکموں، کونسلز کے عہدیداران سے مسلسل خط و کتابت کرنا اور علاقہ کے معززین کے ساتھ ملکر ملاقاتیں کرنا تاکہ علاقہ کے انفرادی و اجتماعی مسائل حل ہوں ۔
☆ بے روزگار، کسانوں اور ٹریڈرز و سمال انڈسٹریز کے مالکان کو بنکوں سے قرضوں کے حصول میں رہنمائی مہیا کرنا ۔
☆ عوام کے انفرادی و اجتماعی قانونی مسائل کے حل کیلئے وکلاء کے ذریعے قانونی امداد فراہم کرنا۔
☆ علاقہ کے اہم اجتماعی مسائل کے حل کی آواز بلند کرنے کیلئے اجتماعی طور پر پرامن احتجاجی پروگرامز منعقد کرنا اور متعلقہ مسئلے کی قرارداد بنا کر متعلقہ محکمہ کے افسران، بلدیاتی افسران، ممبران پارلیمنٹ کو پیش کرنا اور ان مسائل کے حل کیلئے علاقہ میں دستخطی مہم چلا کر قراردادیں متعلقہ ذمہ داران کو پیش کرنا ۔
☆ علاقہ کے موثر افراد، سیاسی شخصیات، ویلفیئر و دینی تنظیمات اور تھانیدار سے مسلسل رابطوں کے ذریعے نیٹ ورک قائم کرنا اور ان مؤثر افراد سے مسلسل میٹنگز کے ذریعے اپنے دادرسی سیل کا مؤثر ابلاغ کر کے علاقہ میں مؤثر

جماعت و تنظیم کے طور پر منوانا۔

☆ متعلقہ علاقہ کے عوام کے نجی تنازعات کے حل کیلئے ''عوامی پنچائیت'' قائم کرنا۔

☆ متعلقہ علاقہ کے عوام میں بیداری شعور کی مہم کو موثر بنانے کیلئے پارٹی کے دفاتر کو ''عوامی ڈیرہ'' قرار دینا اور عوامی ڈیرہ پر بیداری شعور کی کتب و کیسٹس اور باہمی مباحثوں کے ذریعے بیداری شعور کی مہم کو کامیاب بنانا۔

☆ اپنی مدد آپ کے تحت ممکنہ حد تک علاقہ کی ویلفیئر کیلئے جدوجہد کرنا اپنی کارکردگی رپورٹ مسلسل مرتب کرنا اور علاقہ میں موثر ابلاغ کرنا۔

☆ علاقہ کے متاثرین کے دکھ، تکلیف ، بیماری اور خوشی وغمی میں متاثرین سے اظہار یکجہتی کیلئے رابطے کرنا۔

6۔عوامی دادرسی سیل کا طریقہ کار

☆ عوامی دادرسی سیل سے دادرسی حاصل کرنے کے خواہاں سائل سے تحریری طور پر درخواست حاصل کی جائے گی جس میں سائل کا مکمل نام ،ولدیت ، پتہ، دستخط ،فون نمبرز اور مطلوبہ دادرسی کا خلاصہ درج ہوگا اور شناختی کارڈ کی نقل حاصل کی جائے گی ۔

☆ سائل کی درخواست پر کاروائی سے قبل پارٹی کا متعلقہ صدر و جنرل سیکرٹری شکایت کے ازالہ کیلئے متعلقہ مؤثر افراد کے ہمراہ سائل سے تفصیلی میٹنگ کریں گے ۔جسکے بعد متعلقہ مؤثر افراد کے ساتھ ایکشن کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو کہ متعلقہ عدالتوں ،محکموں وکونسلوں سے سائل کے حق میں دادرسی حاصل کرنے کیلئے کارروائی کریں گی ۔

☆ دادرسی کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد سائل کی درخواست پر ہی رپورٹ تحریر کی جائے گی ۔

☆ کسی ظلم و زیادتی، ناجائز مقدمہ وغیرہ کی صورت میں تحریک کے وابستہ افراد اجتماعی صورت میں متعلقہ تھانہ ، پولیس یا حکومتی آفیسر کے دفتر جائیں۔ اس مقصد کیلئے رضا کاران کی ٹیمیں تیار کی جائیں جو ایک فون کال یا SMS سے فوری طور پر طے شدہ جگہ پر پہنچ جائیں اور مظلوم کی دادرسی کیلئے آواز بلند کریں ۔ یہ کام نظم و ضبط اور پرامن انداز میں ہوگا۔ تحریک /PAT کے سینئر قائدین اور وکلاء کا وفد متعلقہ آفیسر سے ملے۔ چند مرتبہ یہ مشق کرنے سے تحریک /PAT کے عہدیداران کو متعلقہ آفیسر کو صرف فون کرنا ہی کافی ہوا کرے گا۔

7۔ دوران خدمات خصوصی احتیاطیں

☆ عوامی دادرسی سیل کے تحت کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی دادرسی فراہم نہ کی جائے گی۔

☆ سیل کے تحت کوئی مذہبی ، گروہی ،خاندانی ،نسلی ،لسانی وعلاقائی منافرت پر مبنی دادرسی فراہم نہ کی جائے گی۔

☆ عوامی دادرسی سیل کو اس طرح سے چلایا جائے کہ علاقہ کی عوام میں پارٹی و قیادت کیلئے نیک جذبات پیدا ہوں۔

☆ عوامی دادرسی کی خدمات پاکستان عوامی تحریک رضا کارانہ بنیادوں پر سرانجام دے گی ۔ملک پر مسلط ظالمانہ واستحصالی نظام کی وجہ سے اگر مسئلہ حل کروانا PAT کیلئے ممکن نہ ہوتو تحریک کے وابستگان و رفقاء اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے کہ مسئلہ حل نہ ہونے کی صورت میں اس کو تحریک میں فتنہ اور انتشار کا سبب نہیں بنایا جائے گا۔

8۔ رپورٹ کارکردگی

عوامی دادرسی سیل کی کارکردگی کا مکمل ریکارڈ لکھا جائے گا اور عوامی دادرسی سیل کی کارکردگی سے بالائی تنظیم و صوبائی تنظیم کو باقاعدہ مطلع کیا جائے گا۔ ❁❁❁❁❁

محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کا دورۂ یورپ

گذشتہ ماہ جون 2013ء میں صدر سپریم کونسل منہاج القرآن انٹرنیشنل محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے یورپ کے درج ذیل ممالک کا تنظیمی و دعوتی دورہ کیا۔

۱۔ یونان ۲۔فرانس ۳۔اٹلی ۴۔سپین

ان ممالک کے دورہ کے دوران انہوں نے کانفرنسز اور ورکرز کنونشنز میں خصوصی شرکت کی اور خطابات کئے۔ علاوہ ازیں ان ممالک کی متعدد نمایاں شخصیات اور منہاج القرآن انٹرنیشنل کی متعلقہ تنظیمات و کارکنان سے بھی خصوصی ملاقاتیں کیں۔ اس دورہ کی اجمالی رپورٹ نذر قارئین ہے:

1۔ یونان

سپریم کونسل منہاج القرآن انٹرنیشنل کے صدر محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری مورخہ 14 جون یونان ایئر پورٹ پہنچے۔ جہاں تنظیمات وکارکنان کی کثیر تعداد نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ اس دورے کا مقصد مرکزی اور تنظیمی معاملات کا جائزہ لینا اور مسلم کمیونٹی کا اصل تشخص گورنمنٹ سطح پر پہنچانا تھا۔ استقبال کرنے والوں میں صدر یورپین کونسل چوہدری اعجاز احمد وڑائچ، جنرل سیکرٹری یورپین کونسل بلال احمد اوپل، حافظ محمد موسیٰ (منہاج یونیورسٹی لاہور)، ناظم پیس اینڈ انٹی گریشن یورپ سید محمد جمیل شاہ، صدر تحریک منہاج القرآن یونان رانا محمد وقار خان، ناظم غلام مرتضیٰ قادری، صدر مجلس شوریٰ میر عارف بٹ، نائب صدر راجہ ضیاء الحق، نائب ناظم و ناظم رابطہ چوہدری محمد اسلم، ناظم نشر و اشاعت مرزا امجد جان، ناظم ویلفیئر و ناظم پیس اینڈ انٹی گریشن مدثر خادم سوہل شامل تھے۔

☆ یونان آمد کے بعد محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے 14 جون کو منسٹری آف پبلک آرڈر کے چیف ڈائریکٹر یورگو کالاجی سے خصوصی ملاقات کی۔ اس ملاقات میں یونان میں بسنے والے پاکستانیوں کے مسائل کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا گیا۔ ملاقات کا اہم مقصد پاکستانی کمیونٹی اور منسٹری پبلک آرڈر کے درمیان تعاون کو مزید بہتر کرنا تھا۔ اس ملاقات میں منسٹری آف پبلک آرڈر کے چیف ڈائریکٹر کو منہاج القرآن کی عالمی سطح پر جاری سرگرمیوں سے بھی آگاہ کیا گیا۔ چیف ڈائریکٹر یورگو کالاجی نے منہاج القرآن یونان کے ساتھ مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی اور یونان بھر میں منہاج القرآن کی سرگرمیوں پر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کو مبارکباد دی۔ ملاقات کے اختتام پر چیف ڈائریکٹر کو شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کا دہشت گردی کے خلاف فتویٰ بھی دیا گیا۔

☆ محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری سے دورہ یونان کے موقع پر وزارت مذہبی امور یونان کے سیکرٹری دمتری پیر دیکی نے بھی خصوصی ملاقات کی۔ ملاقات میں مختلف مذہبی امور پر تبادلہ خیال ہوا۔ اس ملاقات میں مذہبی امور کے جنرل سیکرٹری دمتری پیر دیکی نے منہاج القرآن انٹرنیشنل کی مذہبی امور پر کاوشوں کو سراہا اور مبارک باد دی اور وزارت مذہبی امور کی طرف سے منہاج القرآن یونان کو مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ ملاقات کے اختتام پر مذہبی امور کے جنرل سیکرٹری کو شیخ الاسلام کا لکھا ہوا فتویٰ بھی گفٹ کیا گیا۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل یونان کے زیر اہتمام مورخہ 16 جون 2013ء کو عظیم الشان معراج مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے معجزہ معراج النبی ﷺ پر خصوصی خطاب کیا۔ مرکز کے دونوں فلور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے جن میں منہاج ویمن لیگ کی خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ یونان بھر سے تمام سیاسی، سماجی، مذہبی، بزنس کمیونٹی، تمام ذیلی مراکز اور صحافی برادری نے بھی خصوصی شرکت کی۔

خطاب کے بعد منہاج القرآن سے دس سال سے وابستہ احباب میں حسن کارکردگی کی اسناد بھی ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کے ہاتھوں تقسیم کی گئیں۔

2۔ فرانس

یونان کے کامیابی تنظیمی و دعوتی دورہ کے بعد محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری 17 جون کو فرانس پہنچے۔ منہاج القرآن یوتھ لیگ نے فرانس پہنچنے پر شاندار استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں ناظم اعلیٰ منہاج القرآن انٹرنیشنل شیخ زاہد فیاض، امیر منہاج یورپین کونسل علامہ حسن میر قادری، صدر منہاج یورپین کونسل اعجاز احمد وڑائچ، جنرل سیکرٹری بلال اوپل، منہاج القرآن فرانس کے صدر ملک شبیر احمد اعوان، ناظم قاضی محمد ہارون اور دیگر عہدیداران موجود تھے۔

صدر سپریم کونسل ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے صدر یوتھ لیگ فرانس چودھری ظہیر عباس گجر اور ان کی نو منتخب ٹیم کو ذمہ داریاں سنبھالنے پر مبارکباد پیش کی۔ انہوں نے منہاج یوتھ لیگ فرانس کے سابقہ صدر عمیر اشفاق کو منہاج یوتھ لیگ کے اکیـڈمك چیپـٹـر کا ڈائریکٹر نامزد کیا۔ انہوں نے اکیڈمك چیپٹر کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کی ذمہ داریوں میں شیخ الاسلام کی سرگرمیوں، کتب کی فرنچ ترجمہ، ویڈیوز کی فرنچ کیپشن کے علاوہ کالج اور یونیورسٹی کی رپورٹس ڈائریکٹ مرکز کو ارسال کرنا شامل ہوگا۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل کی سپریم کونسل کے صدر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے مورخہ 18 جون 2103ء کو منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن فرانس کے دفتر کا دورہ کیا۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن فرانس کے دفتر کے وزٹ کے دوران داؤد حسین مشہدی اور منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن یورپ وبرطانیہ کے ڈائریکٹر علامہ حافظ محمد اقبال اعظم بھی موجود تھے۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن فرانس کے صدر محمد نعیم چودھری نے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن فرانس کے پراجیکٹ کی پروجیکٹر کے ذریعے بریفنگ دی۔ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے دفتر کے وزٹ اور ورکنگ پر MWF فرانس کی تنظیم کو مبارکباد دی۔

☆ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے مورخہ 18 جون 2013 کو گارج لے گونس کا دورہ کیا۔ دورہ کے دوران منہاج یورپین کونسل کے امیر علامہ حسن میر قادری، صدر اعجاز وڑائچ، ناظم محمد بلال اوپل، ملک شبیر اعوان (صدر)، قاضی محمد ہارون (ناظم)، چودھری ظفر اقبال (صدر مجلس شوریٰ) اور چودھری محمد اشرف ان کے ہمراہ تھے۔ منہاج القرآن اسلامک سنٹر گارج لے گونس کے ڈائریکٹر علامہ رازق حسین چودھری اور مقامی انتظامیہ نے مہمانوں کا شاندار استقبال کیا۔ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کو گارج لے گونس سنٹر کے بارے میں بریفنگ دی گئی جبکہ علامہ رازق حسین چودھری نے سپاس نامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے تنظیم کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اتحاد واتفاق سے کام کرنے کے موضوع پر گفتگو فرمائی۔

3۔ اٹلی

یونان و فرانس کے تنظیمی و دعوتی دورہ کے بعد محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری 19 جون کو اٹلی پہنچے۔ منہاج القرآن انٹرنیشنل اٹلی کی جانب سے ان کے اعزاز میں مقامی ہوٹل میں ظہرانہ دیا گیا جس میں منہاج یورپین کونسل کے صدر محمد اعجاز وڑائچ، ناظم محمد بلال اوپل، صدر مجلس شوریٰ اٹلی محمد علی بھاگٹ، صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل اٹلی چودھری محمد اقبال، ناظم ظہیر احمد انجم کے علاوہ لوکل میڈیا کے احباب بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے شرکاء سے دنیا بھر میں منہاج القرآن کے کام پر درج ذیل دو حوالوں سے خصوصی گفتگو کی۔

۱۔ پاکستان میں عوامی شعور کی بیداری

۲۔ پاکستان سے باہر اسلام کے اصل چہرہ سے پوری دنیا کو روشناس کرانا

☆ دورہ اٹلی کے دوران محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے مورخہ 20 جون 2013ء منہاج القرآن انٹرنیشنل اٹلی کی ذیلی تنظیم آریزو کے مرکز کا افتتاح کیا۔ آریزو مرکز کے افتتاح کے موقع پر منہاج یورپین کونسل کے صدر اعجاز احمد وڑائچ، صدر ساؤتھ اٹلی اقبال وڑائچ، ڈائریکٹر اسلامک سنٹر غلام مصطفیٰ مشہدی بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے افتتاح کے موقع پر تشریف لائے خواتین وحضرات سے خطاب

کیا اور مقامی تنظیم کو سنٹر کی تیاری پر مبارکباد پیش کی۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل فرانس نے مورخہ 20 جون 2013ء کو صدر سپریم کونسل ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کے اعزاز میں مقامی ریسٹورنٹ میں ظہرانے کا اہتمام کیا۔ جس میں فرنچ ٹی وی لالوکال کی ٹیم ،صوبہ Vam 93 کے امام حسن شال گومی کے علاوہ علماء ومشائخ نے بھی شرکت کی۔ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے ظہرانے کی تقریب میں امن اور برداشت کے موضوع پر عربی زبان میں خطاب کیا۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل کارپی(اٹلی) کے زیر اہتمام مورخہ 21جون 2103ء کو کارپی کی تنظیم نے ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کے اعزاز میں گرینڈ عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں 300افراد نے شرکت کی ۔ گرینڈ عشائیہ میں پاکستانیوں کے علاوہ کارپی شہر کے میئر اور سیکورٹی اداروں کے سربراہان نے خصوصی شرکت کی۔ اس موقع پر کارپی کے میئر نے منہاج القرآن انٹرنیشنل کے کام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ منہاج القرآن ریجوایملیا مودنہ نے 2012ء میں آنے والے زلزلہ کے موقع پر رنگ ونسل کی حدود سے ماورا ہوکر اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے جذبہ سے انسانیت کے لئے امدادی کیمپ لگایا اوراپنے قائد کا پیغام امن ومحبت ''سب سے بڑی عبادت انسانیت کی خدمت ہے'' اٹالین گورنمنٹ کو دیا۔ اٹلی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی مسلم تنظیم نے اتنے بڑے پیمانے پر گورنمنٹ کی مدد کی تھی۔

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے کارپی تنظیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے منہاج القرآن انٹرنیشنل کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور شیخ الاسلام ڈاکٹرمحمد طاہر القادری کی امن وسلامتی کے فروغ کے لئے کی جانے والی کاوشوں پر روشنی ڈالی۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل کارپی(اٹلی) کے زیر اہتمام مورخہ 21جون 2103 کو محفل سماع کے پروگرام میں محترم ڈاکٹرحسن محی الدین قادری نے خصوصی شرکت کی۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل بریشیاء کے زیر اہتمام 23جون بروز اتوار پیغام خلق عظیم کانفرنس منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی جگر گوشہ شیخ الاسلام ڈاکٹرحسن محی الدین قادری تھے۔ نقابت کے فرائض وقار احمد قادری ڈائریکٹر منہاج القرآن بریشیاء نے ادا کئے۔ پروگرام میں خصوصی طور پرحاجی ارشد جاوید، محمد اقبال وڑائچ،سید غلام مصطفیٰ مشہدی، چن نصیب،حاجی اشرف، سید ارشد شاہ اور بریشیاء کی تمام سیاسی اور مذہبی تنظیمات اورعوام الناس کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹرحسن محی الدین قادری نے قرآن مجید سورہ الانشقاق کی آیت نمبر ١٦ تا ١٩ کی تفاسیر کی روشنی میں بڑے خوبصورت انداز میں حضور ﷺ کا فلسفہ معراج وخلق عظیم کو بیان کیا۔

4۔سپین

ڈاکٹرحسن محی الدین قادری نے اپنے دورۂ یورپ کے آخری مرحلہ میں بارسلونا،سپین کا مختصر دورہ کیا۔ جہاں انہوں نے محض 27 گھنٹوں کے قیام کے دوران منہاج القرآن کی مقامی تنظیمات کی طرف سے منعقدہ 8سے زائد مختلف پروگرامز میں شرکت کی۔

26جون 2013ء کی صبح ڈاکٹرحسن محی الدین قادری منہاج یورپین کونسل کے مرکزی عہدیداران کے ہمراہ بارسلونا انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر پہنچے تو منہاج معزز مہمانوں کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ منہاج القرآن انٹرنیشنل سپین کے سرپرست محمد نواز کیانی اور صدر مرزا محمد اکرم بیگ نے ڈاکٹرحسن محی الدین قادری کو گلدستہ پیش کیا۔اس موقع پرمنہاج القرآن انٹرنیشنل سپین کے سیکریٹری جنرل نوید احمد اندلسی، نائب صدر ظل حسن قادری، صدر مصالحتی کونسل محمد اقبال چوہدری، صدر منہاج یوتھ لیگ بلال یوسف،خرم شبیر،محمد عتیق اور محمد آصف قادری بھی موجود تھے۔

☆ اپنی آمد کے بعد محترم ڈاکٹرحسن محی الدین قادری نے منہاج اسلامک سنٹر اوسپتالیت کا دورہ کیا۔ مقامی تنظیم کے صدر حاجی زاہد اختر زاہدی نے ڈاکٹرحسن محی الدین قادری کو منہاج اسلامک سنٹر کے قیام کے بارے تفصیلات سے آگاہ کیا اورانہیں سنٹر کے مختلف گوشوں کا دورہ کروایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے انتہائی مختصر وقت میں اتنے عظیم الشان مرکز کی تعمیر وتکمیل پرخصوصی مبارک باد پیش کی۔

☆ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے بارسلونا کے مضافاتی شہر بادالونا میں واقع منہاج اسلامک سنٹر کا دورہ کیا۔

مقامی تنظیم کے صدر آفتاب حسین ابرار نے دیگر عہدیداران کے ہمراہ استقبال کیا۔ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مساجد کی تعمیر اور انہیں آباد کرنے والوں کے اجر کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے اہل بادالونا کو اللہ کے گھر کو تعمیر کرنے اور اسے آباد کرنے پر خصوصی مبارک باد دی۔

☆ محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے منہاج القرآن انٹرنیشنل سپین کی طرف سے منعقدہ ظہرانہ میں خصوصی شرکت کی۔ جس میں تنظیم کے ایگزیکٹو ممبران کے علاوہ مقامی سپانش کمیونٹی کے رہنماؤں اور پاکستانی کمیونٹی کے معززین نے بھی شرکت کی۔ بادالونا بلدیہ کے سابق ڈپٹی میئر Josep Duran نے ڈاکٹر حسن محی الدین قادری سے خصوصی ملاقات کی ۔مقامی سپانش مہمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے سوشلسٹ پارٹی کے رہنماء Javier Paredes اور مقامی کمیونٹی کے رہنماء Manuel Cortes نے ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کو خوش آمدید کہا اور پاکستانی کمیونٹی کے لیے اپنے نیک جذبات کا اظہار کیا۔

☆ منہاج القرآن انٹرنیشنل سپین کے زیر اہتمام 26 جون بارسلونا کے Apolo Hotel کے وسیع و عریض کانفرنس ہال میں پیغام امن کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں بارسلونا اور گردونواح کے شہروں سے پاکستانی کمیونٹی نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ نقابت کے فرائض نوید احمد اندلسی اور حافظ اقبال اعظم (الازہری) نے سرانجام دیئے۔ کانفرنس میں کاتالونیا کی سوشلسٹ پارٹی کے مرکزی رہنماء Jose Maria Sala نے خصوصی شرکت کرتے ہوئے منہاج القرآن سپین کے کام اور سرگرمیوں کی تعریف کی۔ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے شان مصطفیٰ ﷺ اور امن وسلامتی کے موضوع پر خطاب کیا۔

☆ منہاج اسلامک سنٹر بارسلونا میں رفقاء و وابستگان کے لیے خصوصی تربیتی نشست منعقد کی گئی، جس میں منہاج القرآن انٹرنیشنل سپین اور اس کی جملہ ذیلی تنظیمات بارسلونا، بادالونا، اوسپتالیت ،لوگرونیو اور دیگر شہروں کے عہدیداران و قائدین اور منہاج القرآن کے وابستگان نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے منہاج القرآن سپین کے رفقاء و وابستگان سے دین اسلام اور مصطفوی مشن کی دعوت کے موضوع پر خطاب کیا۔

محترم ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کے دورۂ سویڈن، ناروے اور ڈنمارک کی رپورٹ ماہ ستمبر کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ رفقاء وابستگان سے تربیتی خطاب کے بعد ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے مختلف شعبہ جات میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی تنظیمات اور ممبران کو اسناد حسن کارکردگی سے نوازا جن میں منہاج القرآن بارسلونا، منہاج القرآن بادالونا، منہاج القرآن اوسپتالیت، منہاج القرآن لوگرونیو، منہاج یوتھ لیگ سپین، منہاج نعت کونسل، منہاج ویمن لیگ سپین، محمد نواز کیانی، ظل حسن قادری، نوید احمد اندلسی، محمد اقبال چوہدری، محمد نواز قادری، محمد قدیر احمد خان، چوہدری پرویز اختر اور حاجی لیاقت علی شامل ہیں۔اس موقع پر منہاج القرآن میں شامل ہونے والے نئے ممبران کو ممبر شپ کے سرٹیفکیٹ بھی دیے گئے۔منہاج القرآن اوسپتالیت کے قیام اور مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر حاجی زاہد اختر زاہدی کو خصوصی شیلڈ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

☆ 27جون 2013 کی صبح ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے جامع مسجد منہاج القرآن بارسلونا کا افتتاح کیا جس کے بعد سپین میں منہاج القرآن کے مراکز کی تعداد 5 ہو گئی ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں احسن کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر منہاج القرآن انٹرنیشنل سپین کی طرف سے محمد اسحاق سیال کو خصوصی شیلڈ پیش کی گئی۔

☆ 27جون منہاج القرآن بارسلونا کے زیر اہتمام ڈاکٹر حسن محی الدین قادری سے ہسپانوی مسلمانوں کے نمائندہ محمد یوسف، پاکستانی صحافی برادری اور کمیونٹی کے معززین نے نے خصوصی ملاقات کی۔ اس موقع پر محترم ڈاکٹر حسن محی الدین نے صحافیوں کے مختلف سوالات کے مفصل جوابات دیئے۔

❁❁❁❁❁